فہرست

مضمون نگاران معارف

۱۵۸ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۹۶ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۸

ماہ جولائی ۱۹۹۶ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جولائی ۱۹۹۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ

مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے
پاکستان میں سالانہ دو سو روپے
دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر
بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۸ ماہ صفر المظفر ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۶ء عدد ۱

فہرست مضامین

مقالات

وفیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اردو کو اپنا رسم الخط چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ بہت پرانا ہے، جو وقفہ وقفہ سے دہرایا جاتا اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اس میں اردو کا سراسر مفاد اور بھلائی ہے۔ اس کی وجہ سے اردو کی نہایت قدآور شخصیتوں کو بھی مغالطہ ہو جاتا ہے اور ان کی نظروں سے اس "خیر خواہانہ مشورے" کی مفرتیں اوجھل ہوجاتی ہیں، اب اس پر بھی اخلاص، ہمدردی اور خیر خواہی کی یہ ملمع کاری کی گئی ہے کہ اردو کے تحفظ و بقا اور اس کی وسعت و ترقی کے لئے اس کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کو اردو کے ساتھ ہی دیوناگری رسم الخط میں شائع کرنا ضروری ہے، اس ہمدردانہ مشورہ کا جادو اردو کے ایک بڑے شاعر اور صاحب قلم پر چل گیا ہے اور وہ اردو کو وسیع تر حلقوں تک پہنچانے کے جھانسے میں آگئے ہیں اور اس کے نتائج و عواقب پر غور کئے بغیر اس کی ہم نوائی کرنے لگے ہیں، اس پر اردو والوں نے دارو گیر کی تو وہ پیچ و تاب کھانے لگے اور غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اس کی تاویل کرنے لگے اور یہ حقیقت فراموش کر بیٹھے کہ مغلوب و مفتوح زبان کو غالب و فاتح زبان میں ضم کرنے اور اردو کے وجود و تشخص کو ختم کرنے کی یہ بھی ایک حکمت عملی اور گہری سازش ہے، جسم و جان کا رشتہ ختم ہوجانے کے بعد بھی جسم کو باقی اور زندہ سمجھنا خوش فہمی اور سادہ لوحی ہے۔

کسی زبان کے لئے اس کے رسم الخط کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ تحریر پیش نظر رکھنی چاہئے۔

"رسم خط کی تبدیلی کی مخالفت محض جذباتی لگاؤ کی وجہ سے نہ ہوگی، شاندار ماضی رکھنے والی کسی بھی زبان کے لئے رسم خط کی تبدیلی بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ کیوں کہ رسم خط اس کے ادب کا اہم ترین اور عزیز ترین جز بن جاتا ہے۔ رسم خط کو بدل دیجئے تو صفحہ

قرطاس پر نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں گی۔ یہ نئی صورتیں نئے خیالات اور نئی آوازوں کی حامل ہوں گی قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی ہوجائے گی، قدیم ادب اور قدیم زبان دونوں کی موت واقع ہو جائے گی۔ جس کے پاس محفوظ کرنے کے لئے کوئی قابل قدر ادب نہیں وہاں یہ خطرہ مول لیا جاسکتا ہے، ہندوستان میں ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ کیوں کہ ہمارا ادب نہ صرف قابل قدر اور بیش قیمت ہے بلکہ اس کا ہماری تاریخ اور ہمارے خیالات سے گہرا تعلق ہے، عوام کی زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس قسم کی تبدیلی ظالمانہ غارت گری ہوگی جس سے عام تعلیم کی ترقی کو سخت دھکا لگے گا"۔

اردو کے ایک محب و شیدائی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق سربراہ ڈاکٹر حکم چند نیر لکھتے ہیں:۔

"یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صدیوں کی رفاقت اور چلن سے زبان اور رسم خط میں ایک نوع کی گہری اور اٹوٹ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صدیوں تک ادبیات کی تخلیق، ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت سے زبان اور رسم خط میں جسم اور جان کا رشتہ استوار ہوجاتا ہے.....زبان سے رسم خط کا رشتہ توڑ دیا جائے تو وہ کچھ دنوں تک شاید زندہ رہ جائے لیکن جہاں تک اس کے ادب کا تعلق ہے وہ ضرور مر جائے گا.....اردو رسم خط میں اردو زبان و ادب کی چار سو سالہ ادبی، تاریخی اور سماجی زندگی کی روایات موجود ہیں، ان روایات سے تعلق قطع کر کے اردو زبان اور ادب نہ صرف اپنے کلاسیکی سرمایے سے محروم ہو جائیں گے بلکہ اپنی حیثیت اور حقیقت کھو بیٹھیں گے، ان کی انفرادیت ختم ہوجائے گی اور انہیں زندگی کے لالے پڑ جائیں گے، اردو ادب کے تمام قدیم و جدید ادبی سرمایے کو ناگری رسم خط میں منتقل نہیں کیا جاسکتا اور اگر منتقل کیا جائے گا تو اس انتقال میں نہ جانے کتنے لفظوں، محاوروں، بندشوں، ترکیبوں، اصطلاحوں اور تشبیہوں کا خون ہو جائے گا اور ادب اپنی تمام آب و تاب اور توانائی سے محروم ہو جائے گا۔ ہماری نئی نسلیں اگر اردو رسم خط سے بے بہرہ ہوں گی تو وہ اردو ادب کی روح تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گی"۔

لطف و کرم کی یہ بارش اردو ہی پر کیوں ہو رہی ہے اور تمام ہندوستانی زبانوں میں سے صرف اسی کو دیوناگری رسم خط اپنانے کی دعوت اس قدر اصرار سے پیہم کیوں دی جارہی ہے، پنجابی، بنگالی، مراٹھی اور گجراتی وغیرہ ہند آریائی زبانیں اور تامل، تیلگو، کنڑ ملیالم وغیرہ دراوڑی زبانیں بھی دوسرے خطوں میں لکھی جاتی ہیں، آریائی زبانوں کے خط اور ہندی کے دیوناگری خط شکل، شباہت اور ساخت میں ملتے جلتے ہیں، جب اس قدر قربت و تعلق کے باوجود وہ ناگری رسم خط اپنانے کے لئے تیار نہیں ہیں تو اردو سے کیوں یہ توقع کی جارہی ہے کہ وہ ناگری رسم خط اختیار کرلے گی، اردو کے یہ خیر خواہ یہ شوشہ چھوڑ کر خط محبت بھی کرتے ہیں کہ انگریزی، فرنچ اور جرمن وغیرہ رومن رسم خط میں لکھے جانے کے باوجود اگر زندہ ہیں تو اردو دیوناگری رسم خط اپنا کر موت سے کس طرح ہم کنار ہو جائے گی، حالانکہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ اپنے وجود کے وقت ہی سے رسم خط کو اپنائے ہوئے ہیں، جب ان زبانوں کا اپنا کوئی رسم خط ہی نہ تھا تو ان کو رومن رسم خط اپنانے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا، پھر ان ہی یوروپی اقوام نے اس رسم خط کو چھوڑنا تو درکنار اس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم بھی قبول نہیں کی۔ ایک ترکی کی مثال ضرور ہے جس نے اپنی زبان کے لئے رومن رسم خط اختیار کیا جس کا خمیازہ بھی وہ بھگت رہا ہے۔

متحدہ محاذ کی حکومت نے بابری مسجد کے معاملہ کو دستور کی دفعہ ۱۳۸ (۲) کے تحت سپریم کورٹ کے حوالے کرنے کا اعلان کیا ہے، اس کی جس قدر شدت سے ہندو تنظیمیں مخالفت کررہی ہیں، اسی قدر شدت سے مسلم تنظیمیں بھی مخالفت کررہی ہیں، جس وقت نرسمہاراؤ کی حکومت نے دفعہ ۱۴۳ (اے) کے تحت یہ معاملہ سپریم کورٹ کی رائے دریافت کرنے کے لئے بھیجا تھا، اس وقت تمام مسلم جماعتیں وہی چاہتی تھیں جس کو اب متحدہ محاذ حکومت نے کرنے کا اعلان کیا ہے، ہماری شروع سے یہ رائے ہے کہ بابری مسجد کو اس شدید تکلیف دہ مقام تک پہنچانے کے ذمہ دار ناعاقبت اندیش مسلم لیڈر بھی ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ کا ایک ہنگامی جلسہ اسی موضوع پر نئی دلی میں ۷ جولائی کو ہورہا ہے، اس سے کچھ توقع ہے مگر اس میں بھی بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور بابری مسجد رابطہ کمیٹی کا عمل دخل ہے، کاش مسلم زعما مسلمانوں پر رحم کرتے اور بابری مسجد کے مسئلہ کو طول دے کر اور پیچیدہ بنا کر مسلمانوں کے کشت و خون اور تباہی و بربادی کا مزید سامان نہ کرتے۔

مقالات

عہد نبوی میں رضاعت

از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی علی گڑھ

(۳)

رضاعت حضرت عقبہ نوفلی

خاندان بنو عبد مناف اور خانوادۂ بنو نوفل کے ایک دوسرے عظیم فرزند حضرت عقبہ بن الحارث کے بارے میں مختلف محدثین کرام اور سیرت نگاروں نے ایک بہت اہم روایت اور گوناگوں قانونی اہمیت کی حامل حدیث اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ ان کا مجموعی بیان یہ ہے کہ حضرت عقبہ بن حارث نوفلی نے ابو اہاب کی دختر ام یحییٰ سے شادی کی اور کافی مدت کے بعد ایک عورت جس کو سیاہ فام باندی (امۃ سوداء) کہا گیا ہے آئی اور اس نے کہا کہ میں نے عقبہ اور ان کی بیوی کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عقبہ بن حارث نے کہا کہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم نے مجھے دودھ پلایا ہے، نہ تم نے پہلے کبھی بتایا۔ پھر وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسئلہ پوچھنے گئے۔ ابن سعد کے بقول انہوں نے کہا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو کیا معلوم کہ وہ جھوٹی ہے اور چونکہ یہ بات کہی جا چکی ہے اس لیے اس کو چھوڑ دو چنانچہ حضرت عقبہ نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور ان کی کسی دوسرے شخص سے شادی ہوگئی۔[1]

رضاعت حضرت عائشہؓ حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان اموی کے علاوہ کم از کم دو اور امہات المومنین کی رضاعت کا ذکر خیر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت عائشہ صدیقہ بنت حضرت ابی بکر صدیق بھی ہیں۔ روایات و احادیث کے مطابق حضرت ابو القعیس کی بیوی نے حضرت عائشہ کو دودھ پلایا تھا۔ ابو القعیس کے بھائی حضرت افلح بن قعیس جب مدینہ منورہ آئے تو حضرت عائشہ سے ملاقات کرنے کی اجازت مانگی لیکن ام المومنین نے انکار کر دیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ مجھ سے پردہ کرتی ہیں حالانکہ میں آپ کا چچا ہوں۔ انہوں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہا کہ میرے بھائی کی بیوی نے میرے بھائی کے دودھ کے ساتھ آپ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ حضرت عائشہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں سوال کیا تو آپؐ نے ان کو گھر میں آنے کی اجازت دینے کا حکم دیتے ہوئے حضرت افلح کی تصدیق کی۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کو پھر بھی اشکال تھا۔ اسی بنا پر اس کے ازالہ کے لیے پوچھا کہ مجھ کو تو ابو القعیس کی بیوی نے دودھ پلایا تھا پھر حضرت افلح میرے چچا کیسے ہو گئے؟ اس کی وضاحت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام و مقدس ہوتے ہیں جو نسب سے ہوتے ہیں۔[۲] اسی نوع کی ایک دوسری روایت حضرت عائشہ سے متعلق یہ ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے یہاں تشریف لائے تو ان کے پاس ایک مرد کو بیٹھے ہوئے دیکھا آپؐ نے ان کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ میرے رضاعی بھائی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصول رضاعت بیان فرمایا کہ عائشہ اپنے بھائیوں کے بارے میں محتاط رہنا کہ کون کون ہیں کیونکہ رضاعت بھوک سے (بچپن میں مدت شیرخوارگی

میں ہی) ثابت ہوتی ہے۔[۳]

رضاعتِ حضرت حفصہ تیسری ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر خطاب عدوی ہیں، جن کی رضاعت کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف فرما تھے کہ اسی دوران ان کے کان میں ایک مرد کی آواز آئی جو حضرت حفصہ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت کی طالب تھی۔ حضرت عائشہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے خیال میں وہ حضرت حفصہ کے رضاعی چچا ہیں پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ شخص آپ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے ہیں؟ تو آپؐ نے بھی ان کو حضرت حفصہ کے رضاعی چچا ہی کے بطور پہچانا۔ اس پر حضرت عائشہ نے کہا کہ اگر میرے فلاں رضاعی چچا زندہ ہوتے تو وہ بھی میرے ہاں آتے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں رضاعت ان تمام چیزوں کو حرام قرار دیتی ہے جن کو ولادت قرار دیتی ہے۔[۴]

رضاعت حضرت سعد بن ابی وقاص زہری اکابر صحابۂ کرام میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کے بارے میں ابن سعد کی ایک ادھوری روایت حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب عدوی کے سوانحی خاکہ میں یہ ملتی ہے کہ کوئی عورت حضرت سعد بن ابی وقاص کی دایہ/ظئر تھی یا وہ شخص ان کا دودھ شریک بھائی تھا جو مدینہ منورہ میں کتاب کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کی وضاحت مشکل ہے کیونکہ کتاب میں اس مقام پر بیاض ہے۔[۵]

کی حیات طیبہ کے دو رخ کے دوسرے قریشی اکابر اور عرب شیوخ و افراد کی رضاعت و کفالت کی زیادہ تفصیلات نہ ملنا کوئی قابل تعجب بات نہیں۔ اصل بات یہ

ہے کہ عرب معاشرہ کے دونوں ادوار عہد جاہلی اور عہد اسلامی اور ان کے مختلف مراحل و منازل میں رضاعت کا نظام اتنا معروف و مقبول تھا کہ اس کے بارے میں تفصیلات بیان کرنا زیادہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جس قدر تفصیلات و اشارات ملتے ہیں وہ دراصل کسی قانونی، اخلاقی، فقہی یا دستوری اصول کی وضاحت کے لیے دوران کلام آتے ہیں، جیسے حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہ اور دوسری امہات المومنین اور اکابر صحابہ کے بارے میں شہادتیں آتی ہیں یا سوانحی اہمیت یا سیاسی پس منظر نمایاں کرنے کی خاطر، جیسے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رضاعی بھائیوں حضرات حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی اور ابوسلمہ بن عبد الاسد مخزومی اور ابوسفیان بن حارث ہاشمی کے ضمن میں معلوم ہوتا ہے۔ اسی قسم کا معاملہ حضرت عبد اللہ بن سعد عامری کا تھا جن کی رضاعی رشتہ داری کو حضرت عثمان بن عفان کے خلاف بطور آلۂ طعن استعمال کیا گیا ہے[۵]

(ب) مدنی عہد نبوی رضاعت ابن زبیر مدنی عہد نبوی سے متعلق بھی رضاعت اطفال کی بہت سی دلچسپ روایات اور اہم واقعات ملتے ہیں۔ ان میں غالباً سب سے پہلا واقعہ حضرت عبد اللہ بن زبیر کی رضاعت کا ہے کہ بقول سیرت نگاران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہ اولین مولود اسلامی تھے جو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں تولد ہوئے تھے۔ امام ابو داؤد نے ان کی سند سے ایک روایت غزوۂ موتہ کے باب میں بیان کی ہے جو حضرت عبد اللہ بن زبیر اسدی قریشی نے اپنے رضاعی باپ کی سند پر بیان کی ہے، جن کا تعلق بنو مرہ بن عوف / خزرج سے تھا۔ اگرچہ امام ابو داؤد نے اس حدیث کو قوی نہیں کہا ہے تاہم اس سے رضاعت ابن زبیر ثابت ہوتی ہے۔

مولانا فخر الحسن گنگوہی نے اپنی "التعلیق المحمود" میں ان کی شناخت نہیں کی ہے۔

رضاعت حضرت زینب دوسری سب سے دلچسپ روایت حضرت ام المومنین ام سلمہ کے بارے میں ابن سعد نے نقل کی ہے کہ ۳ھ میں حضرت ابوسلمہ بن عبد الاسد مخزومی (جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے کہ حضرت ثویبہ کے دودھ میں آپ کے شریک سعادت تھے) کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اہلیہ حضرت ام سلمہ سے شادی کی تو ان کی گود میں ایک شیر خوار بچی زینب یا زناب تھیں چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ان کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ بچی رونے لگتی اور حضرت ام سلمہ اس کو دودھ پلانے لگتیں۔ حضرت عمار بن یاسر کو بچی کی دخل اندازی بڑی ناگوار گزرتی تھی۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے اس بچی کو گود میں اٹھا یا اور اس کو رضاعت کے لیے قبا کی بستی میں لے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو بچی کے بارے میں سوال کیا حضرت ام سلمہ کے پاس ایک عورت بیٹھی تھیں انہوں نے بتایا کہ حضرت عمار اس کو رضاعت کے لیے قبا لے گئے ہیں۔ ابن سعد نے اس قسم کی تین روایات بیان کی ہیں[۶]

رضاعت حضرات حسنینؓ امام ابن ماجہ نے ایک اہم حدیث حضرت ام الفضل زوجہ محترمہ حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپؐ کے مبارک اعضاء میں سے ایک عضو میرے گھر میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ آپ نے اچھا خواب دیکھا ہے۔ فاطمہ کے ہاں ایک بچہ ہوگا جس کو آپ دودھ پلائیں گی۔ حضرت فاطمہ کے ہاں جب حضرت حسین یا حضرت حسن پیدا ہوئے تو حضرت ام الفضل کا بیان ہے کہ میں نے ان کو اپنے

فرزند حضرت قثم کے دودھ میں شریک کیا۔ پھر میں ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں لائی اور آپ کی گود میں رکھ دیا تو انہوں نے پیشاب کر دیا۔ اس پر میں نے
بچے کے کندھے پر ہاتھ مارا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ آپ پر رحم کرے
آپ نے میرے بچے کو تکلیف دی ہے[۸]۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے ایک بلا سند
روایت یہ نقل کی ہے کہ حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کی دایہ کا نام سودہ
بنت مسرح الکندیہ تھا۔ انہوں نے بلا حوالہ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ "نبی صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم)
کا آزاد کردہ غلام ابو رافع سلمیٰ دایہ ... کا شوہر تھا" اور حضرت سلمیٰ سیدہ مادر زبیر
رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ لونڈی ہیں۔ سیدہ فاطمہ بتول کے تمام بچوں کی قابلہ بھی یہی
ہیں۔ سیدہ بتول کے غسل میں بھی مع اسماء بنت عمیس یہی شامل تھیں۔ غزوۂ خیبر
میں بھی شریک ہوئیں[۹]۔

رضاعت فرزند نبوی | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس عربوں کی اس
قدیم روایت کی پاسداری کرنے کے علاوہ اس کو سنت بھی بنا دیا۔ امام مسلم کی
روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند گرامی حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ
پیدا ہوئے تو آپ نے ان کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر رکھا اور ان کو
مدینہ منورہ کے ایک لوہار (قین) حضرت ابو سیف کی اہلیہ حضرت ام سیف کو
رضاعت و پرورش میں دے دیا۔ آپ اکثر ان کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔ حضرت انس
بن مالک انصاری خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ وہ بھی آپ کے
ساتھ جایا کرتے تھے۔ ایک بار تشریف لے گئے، تو حضرت ابو سیف اپنی دھونکنی /
انگیٹھی (کیر) دھونک رہے تھے جس سے پورا گھر دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ حضرت انس نے

آگے جا کر حضرت ابو سیف کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر دی اور کام
روکنے کو کہا جس کی انہوں نے تعمیل کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کو بلا کر سینے سے
چمٹایا اور جو فرمانا چاہا فرما کر واپس تشریف لے آئے۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے بلا
حوالہ لکھا ہے کہ "ام بردہ بنت المنذر بن زید الانصاری نے جو براء بن اوس انصاری
کی زوجہ ہیں ان (حضرت ابراہیم) کو دودھ پلایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام بردہ کو
ایک قطعہ نخلستان عطا فرمایا تھا۔ ابن سعد نے بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم کی ولادت
کے بعد انصاری خواتین میں مسابقت ہوئی کہ ان کو کون دودھ پلائے۔ بالآخر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت ام بردہ کے حوالہ کر دیا جو ان کو دودھ پلاتی تھیں اور
وہ بنو النجار میں اپنے رضاعی ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
اکثر حضرت ام بردہ کے ہاں تشریف لے جاتے اور قیلولہ فرماتے اور حضرت ابراہیم سے
ملاقات کرتے تھے"۔ ابن سعد نے اس کے بعد ہی ابو سیف اور عوالی مدینہ میں واقع
ان کے گھر میں حضرت ابراہیم کی رضاعت کی روایت بھی دی ہے[۱۰]۔

رضاعت فرزندان جعفر | امام مالک کی ایک روایت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت جعفر
بن ابی طالب ہاشمی رضی اللہ عنہ کے دو بیٹوں کی رضاعت و کفالت کی ذمہ داری رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی تھی۔ حمید بن قیس مکی کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے پاس حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو بیٹے لائے گئے، تو آپ نے ان کی
دایہ (حاضنہ) سے کہا کہ کیا بات ہے یہ دونوں کمزور نظر آ رہے ہیں۔ دایہ نے عرض
کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو نظر تیزی سے لگتی ہے اور ہم ان کے
لیے جھاڑ پھونک بھی نہیں کر سکتے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ کو پسند آئے گا یا نہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ان کے لیے جھاڑ پھونک کرو اگر تقدیر جاری ہوئی تو نظر ضرور لگے گی۔ اس روایت میں اگرچہ رضاعت کا ذکر واضح نہیں پایا جاتا لیکن اس کا قوی قرینہ ضرور موجود ہے۔[۱۱]

بہر حال ان چند تاریخی شہادتوں اور سوانحی روایتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ رضاعت کی روایت صرف مکی دور نبوی یا قریش بطحا تک محدود و محصول نہ تھی بلکہ وہ مدینہ منورہ کے انصاری قبائل اور پھر اسلامی ریاست کے مختلف ادوار میں بالخصوص عہد نبوی میں جاری و ساری رہی تھی۔ یہاں ایک نکتہ کی وضاحت کر دی جائے کہ قابلہ (دایہ) حاضنہ (انا) اور مرضعہ (دودھ پلائی) کے تین الگ الگ کام تھے لیکن حاضنہ بسا اوقات مرضعہ بھی بن جاتی تھی خاص کر شیر خوار بچوں کی۔ کیونکہ ان کی خورد و نوش کا الگ انتظام کرنا کافی مشکل تھا۔

رضاعت سالم مولیٰ ابی حذیفہ

متعدد محدثین کرام نے ایک بہت اہم روایت یہ بیان کی ہے کہ مشہور صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ عبدشمسی کی اہلیہ محترمہ حضرت سہلہ بنت سہیل عامری کو اپنے غلام، مولیٰ اور متبنیٰ حضرت سالم سے بہت محبت تھی اور وہ اکثر ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ حضرت ابو حذیفہ کو ان کی آمد و رفت ناگوار گزرتی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا بنفس نفیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سہلہ کو مشورہ دیا کہ وہ حضرت سالم کو اپنا دودھ پلا دیں چنانچہ انہوں نے مشورہ مان کر ان کو بڑی عمر میں چار یا پانچ گھونٹ دودھ پلادیا اور ان کے رضاعی فرزند بن گئے۔ بعد میں حضرت سہلہ نے حضرت سالم سے اپنی بھتیجی حضرت فاطمہ بنت الولید بن عتبہ بن ربیعہ عبدشمسی کی شادی کر دی جو اولین مہاجرات

میں سے تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی اذن نبوی کے سبب بڑی یا پکی عمر میں بھی رضاعت کی حرمت و ثبوت کی قائل تھیں اور اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں کو مشورہ دیا کرتی تھیں کہ وہ جن مردوں کا آنا جانا اپنے گھروں میں پسند کرتی ہوں ان کو پانچ گھونٹ دودھ پلا دیا کریں تاکہ وہ ان کے رضاعی بیٹے بن جائیں اور ان کی آمد و رفت میں حجاب وغیرہ کی قباحتیں حائل نہ ہوں۔ دوسری ازواج مطہرات نے حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کے واقعہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی اجازت قرار دے کر بڑی عمر میں رضاعت کے ثبوت کو تسلیم نہیں کیا ہے اور دوسرے اکابر صحابہ اور عام فقہائے اسلام کا بھی یہی مسلک ہے کہ وہ صرف مدت شیر خوارگی میں ہی رضاعت کی حرمت و تقدیس اور ثبوت کے قائل ہیں۔[۱۲]

مسلم اور یہودی کی مشترکہ رضاعت

امام بخاریؒ نے ایک بہت اہم روایت اپنی جامع صحیح میں رضاعت کے سلسلہ میں نقل کی ہے جو عرب کی سماجی زندگی کے بعض اہم گوشے سامنے لاتی ہے۔ اس کے مطابق حضرت ابو نائلہ مشہور دشمن اسلام اور یہودی لیڈر کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے اور اسی رشتہ کی تقدیس و احترام و اعتماد میں وہ رات کو پکارے جانے پر اپنے قلعہ سے اتر آیا تھا۔ امام موصوف کی روایت میں ہے کہ جب کعب بن اشرف کو اس کے اہل و عیال نے جانے سے روکا تو اس نے کہا کہ میرا بھائی ابو نائلہ اور دوسری روایت کے مطابق میرا رضاعی بھائی (رضیعی) ابو نائلہ مجھے بلانے والوں میں شامل ہے لہذا مجھے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ ان روایات میں یہ تصریح نہیں ملتی کہ ان دونوں کو رضاعت کے مقدس رشتے میں کس ذات مادر نے باندھا تھا مگر یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ رضاعت بچپن کے ایام سے متعلق تھی جب دونوں

اسلام سے پہلے ایک ماں کے آنچل میں پلے بڑھے تھے مگر اسلام آنے کے بعد بھی اس رشتہ کی حرمت قائم و دائم رہی۔[۱۳]

خلافت اسلامی میں رضاعت یہ مسئلہ یا تہذیبی و سماجی معاملہ اگرچہ ہمارے موجودہ مبحث کے دائرے سے باہر ہے تاہم صرف ایک مثال اس دور کی بھی پیش کی جارہی ہے جو عہد نبوی کو اس کے بعد کے خیر القرون سے جوڑتا ہے اور جو رضاعت کے اسلامی تسلسل کو بھی واضح کرتا ہے۔ ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک بہن حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر تیمی بھی تھیں جو آج نسبتاً غیر معروف ہیں۔ لیکن اپنے عہد میں ایک اہم اور معروف شخصیت تھیں۔ وہ صحابی جلیل حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کی زوجہ مطہرہ تھیں اور ان کے بعد دوسرے بزرگ حضرت عبد الرحمٰن بن عبد اللہ مخزومی کی اہلیہ بنی تھیں۔ ان دونوں شوہروں سے ان کی کئی اولادیں تھیں۔ انہیں حضرت ام کلثوم نے اپنی بہن ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فرمائش پر حضرت عمر فاروقؓ کے پوتے حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر عدوی (م ۱۰۶ھ/۷۲۵ء) کی رضاعت کی ذمہ داری سنبھالی تھی اور غالباً تین بار ہی وہ "رضاعت" کر سکیں کہ بیمار ہو گئیں۔ غالباً اس کے بعد وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکیں کہ روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے۔ حضرت سالم کی ولادت کے معاً بعد یہ واقعہ رضاعت پیش آیا تھا اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ ان کے لیے کسی دوسری مرضعہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ بہرحال ایسی مثالیں اور شہادتیں بہت سی تلاش کی جا سکتی ہیں جو اسلامی خلافت کے دوسرے ادوار میں رضاعت کی روایت کے تسلسل کو ثابت کرتی ہیں۔ مگر سردست ان سے ہمیں سروکار نہیں۔[۱۴]

تجزیہ و تحلیل گو یہ مقالہ رضاعت کی تمام تفصیلات کا حامل نہیں تاہم اس سے یہ مدلل

طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جس طرح عہد جاہلی میں رضاعت کی روایت عربوں بالخصوص حرمین شریفین میں قائم و استوار رہی تھی اسی طرح وہ عہد نبوی کے دونوں مکی اور مدنی ادوار میں جاری و ساری رہی اور بعد میں اسلامی خلافت کے مختلف زمانوں میں بھی۔ اسی طرح وہ مکان و مقام کی بھی حد بندی سے آزاد تھی کہ پورے عرب میں مقبول و محفوظ رہی۔

رضاعت کے بارے میں عام تصور یہ ہے اور بڑی حد تک صحیح بھی ہے کہ شیر خوار بچوں کو دیہات کی کھلی ہوا، صاف ستھری فضا اور بدوی زندگی کی قدرتی رعنائیوں سے فیضیاب ہونے کے لیے بدوی دودھ پلائیوں کے حوالے کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ پوری حقیقت نہیں ہے۔ بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رضاعی بھائی حضرت ابو سفیان بن حارث ہاشمی کو ہوازن/بنو سعد بن بکر کے علاقے کی صاف و شفاف فضا اور ان کی فصاحت و بلاغت سے متمتع کرنے کے لیے حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے حوالے کیا گیا تھا اور جس کے نتیجہ میں ان کی صحت و تندرستی اور زبان و بیان پر آب و تاب آگئی تھی۔[۱۵] لیکن متعدد اکابر اور اہم افراد کے بارے میں دیہاتی رضاعت کا حوالہ نہیں ملتا اور ان میں حضرات حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی، ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومی، عثمان بن عفان اموی، عبد اللہ بن سعد عامری اور کئی دوسری عظیم شخصیات شامل ہیں کہ ان کی رضاعت مکہ مکرمہ ہی کی یا دوسرے شہروں کی خواتین نے انجام دی تھی۔ ان میں سے متعدد حضرات صحت و جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی قابل رشک تھے اور زبان و بیان، فصاحت و بلاغت میں بھی ممتاز تھے۔

اس ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ رضاعت کا کام کرنے والی پیشہ ور خواتین

بدوی علاقوں میں بھی تھیں اور شہری دیار و امصار میں بھی اور حضرت حلیمہ سعدیہؓ اور حضرت عبیداللہ بن عدی نوفلی / عبد مناف کی دوسری سعدیہ دودھ پلائی اور غالباً امہات المومنین حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کی "مرضعات" بدوی تھیں لیکن ان کے پہلو بہ پہلو شہری مرضعات بھی تھیں جیسے حضرت ثویبہ / مکہ کی شہری خاتون تھیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن سعد عامری کی ماں معانہ بنت جابر اگرچہ اشعری / جنوبی قبیلہ کی فرد تھیں تاہم وہ رشتۂ ازدواج کے سبب شہری تھیں۔ ربیعہ بن حارث ہاشمی کے فرزند کی مرضعہ بنو سعد یا بنو لیث کے بدوی قبیلہ کی تھیں تو حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان اموی اور خاندان اسد / خزیمہ کے نومسلم اور پھر عیسائی ہو جانے والے عبیداللہ بن جحش کی دونوں دودھ پلائیاں امیہ بنت قیس اور برکہ بنت یسار مکی اور شہری تھیں۔ حضرت ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات حسن و حسین کی رضاعی مائیں بھی شہری تھیں۔ حضرت زینب (زناب) بنت ابی سلمہ مخزومی، حضرت سالم مولی ابی حذیفہ اور حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر عدوی ان سب کی رضاعت بھی شہری خواتین نے کی تھی۔ ہماری معلوم "مرضعات" میں سے اکثر شہری ثابت ہو رہی ہیں۔ لہذا بدوی رضاعت اور مرضعات کا دعویٰ جزوی طور سے صحیح ہے[۱۴]

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ "رضاعت" تین طرح سے انجام دی جاتی تھی۔ ایک پیشہ ور خواتین تھیں جو اجرت پر یہ کام کرتی تھیں خواہ اس کے اسباب کچھ ہوں اور ممکن ہے کہ بعض عرب قبائل میں "دودھ کی آمدنی" کو قابل نفریں یا حقیر سمجھا جاتا ہو لیکن ایسا صرف مغرور قبائلی عصبیت میں سرشار لوگوں کے ہاں ہی ہوگا۔ عام عرب قبیلوں اور روایات میں "مرضعات" کا کام خاصا باوقار اور محبت آمیز سمجھا جاتا تھا۔

خاص کر رضاعی فرزند و دختر اپنے رضاعی والدین اور بھائی بہنوں اور ان کے قبیلوں سے یگانگت و مودت کے تعلقات رکھتے تھے اور ان کا زندگی بھر احترام و لحاظ کرتے تھے[۱۵]۔ دوسری وہ خواتین تھیں جو کسی نسبت، قرابت، مودت یا تعلق خاطر کے سبب اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے عزیزوں اور اہل قرابت و تعلق کے بچوں کو بھی ازراہ محبت و شفقت دودھ پلا دیا کرتی تھیں۔ جیسے حضرت ام الفضل ہاشمی نے اپنے پرنواسے حضرات حسن و حسین کو اور حضرت عبداللہ بن سعد عامری کی ماں معانہ بنت جابر اشعری نے اپنے عزیز حضرت عثمان اموی کو دودھ پلا دیا تھا۔ یہی صورت حال حضرت ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت حضرت ام بردہ انصاری وغیرہ کے ضمن میں بھی نظر آتی ہے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ مخصوص حالات کے تقاضوں اور آقاؤں اور بزرگوں کے حکم پر رضاعت کی جاتی تھی جیسے حضرت ثویبہ نے اپنے مالک ابولہب ہاشمی کے حکم پر یا حضرت زینب مخزومی کی دایہ قبانے حضرت عمار بن یاسر کی فرمائش پر یا حضرت ام کلثوم تیمی نے اپنی بہن حضرت عائشہ تیمی کے ارشاد پر رضاعت کا فریضہ انجام دیا تھا۔ اسی ضمن میں تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے باب میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی، بچیاں بھی رضاعت کے لیے "مرضعات" کے سپرد کی جاتی تھیں[۱۶]

بہرکیف رضاعت ہمیشہ ایک مقدس اور محبت آگیں کاروبار فطرت رہا ہے جاہلی روایات میں وہ صرف پرورش و پرداخت کا ایک قدرتی طریقہ تھا۔ اسلامی معاشرہ اور الٰہی قانون میں اس کو محبت خیز تقدیس کا درجہ و مقام ملا۔ خون و نسب اور ولادت کے رشتوں کی مانند اس کو تقدیس و تحریم ملی۔ رضاعی ماں باپ نسبی والدین

کی مانند اور رضاعی بھائی بہن صلبی فرزند و دختر کی طرح قرار پائے اور خون کی طرح دودھ نے حرمت وطہارت پائی جس طرح عہد نبوی کی رضاعت کی روایات اس کاروبار فطرت کو قانونی، فقہی اور اسلامی تقدیس ہمیشہ کے لیے عطا کرتی ہیں جن کا انکار بدیہی واقعات کے انکار کے مرادف ہے۔

تعلیقات وحواشی

[1] ابن سعد، پنجم، ۷-۴۶ نے مختصر خاکہ میں ان کے نام و نسب کے علاوہ صرف رضاعت کا یہی واقعہ مختصراً لکھا ہے۔ حتی کہ ان کی تاریخ وفات تک نہیں دی۔ نیز ملاحظہ ہو: بخاری، کتاب العلم، باب الرحلۃ فی مسئلۃ النازلۃ وتعلیم اھلہ (۱/۳۳)، کتاب الشھادات، باب اذا شھد شاھد، شھود بشئ (۳/۲۱-۲۲۰)، باب شھادۃ الاماء والعبید، باب شھادۃ المرضعۃ (۳/۷-۲۲۶)، کتاب لنکاح، باب شھادۃ المرضعۃ (۷/۱۳) ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ، باب الشھادۃ فی الرضاع (۳/۷-۳۰۶)، ترمذی، ابواب الرضاعۃ، باب فی شھادۃ المرأۃ الواحدۃ فی الرضاع (۱/۵-۲۲۴) [2] بخاری، کتاب الشھادۃ ، باب الشھادۃ علی الانساب والرضاع المستفیض الخ، کتاب التفسیر سورۃ الاحزاب (۶/۵۱-۱۵۰)، کتاب النکاح باب امھاتکم التی ارضعنکم (۷/۱۱) مسلم کتاب الرضاع، باب تحریم الرضاعۃ (۲/۱۰۶۹) ابوداؤد، کتاب النکاح باب فی لبن الفحل (۲/۲۲۲)، ترمذی، ابواب الرضاع، باب فی لبن الفحل (۱/۲۲۴) امام بخاری، کتاب الادب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم تربت یمینک (۸/۴۵) میں اضافہ کیا ہے کہ حضرت افلح نے حکم حجاب کے بعد داخلہ کی اجازت مانگی تھی۔ حضرت ابوالقعیس کے بارے میں ابن اثیر، اسد الغابہ، پنجم، ۲۷۰ نے صرف اسی واقعہ رضاعت کا ذکر کیا ہے۔ حضرت افلح کے بارے میں بھی

صرف اسی واقعہ رضاعت کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن اثیر، اسد الغابہ اول، ۱۰۶، البتہ انہوں نے حضرت افلح اور حضرت ابوالقعیس دونوں کو ایک ہی شخصیت ثابت کرنے والی روایات بھی مختصراً دی ہیں جو ظاہر ہے غلط ہیں اور اس روایت حدیث کے رواۃ کے اسمائے گرامی نقل کیے ہیں۔ امام مسلم نے ان کی کنیت ابوالجعد بیان کی ہے [3] بخاری، کتاب النکاح، باب وامھاتکم التی ارضعنکم (۷/۱۲-۱۱)، مسلم، کتاب الرضاع، باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من الولادۃ (۱/۴۴۴ اور ۲/۱۰۶۸) [4] بخاری، کتاب النکاح، باب وامھاتکم التی ارضعنکم (۷/۱۲-۱۱)، مسلم، کتاب الرضاع، باب ما یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من الولادۃ۔
[5] ابن سعد، پنجم، ۱۵ [6] دوسرے اسباب ومحرکات کا ذکر برابر رضاعت کے واقعات کے ضمن میں آ رہا ہے لہذا ان پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ حضرت عبداللہ بن سعد عامری کے بارے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اموی پر جب ہمارے قدیم وجدید تاریخ داں جھوٹے الزامات خویش پروری وغیرہ کے لگاتے ہیں تو منجملہ دوسرے اموی اکابر کے حضرت عبداللہ بن سعد عامری کے اسی رشتہ رضاعت کو آلۂ کار بناتے ہیں، ملاحظہ ہو: ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، سوم، ۲۴ نے جو روایت نقل کی ہے دوسروں نے بھی کی ہے اس کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے اور محض ان کے سبب ان کی جاں بخشی کی گئی اور وہ بھی کرا ہتاً۔ حضرات عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، وحشی بن حرب، کعب بن زہیر، عبداللہ بن زبعری، ہند بن عتبہ اور صفوان بن امیہ وغیرہ کو آخر کیوں معاف کیا گیا؟ یہاں مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ نیز ملاحظہ ہو: ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۱۹۶۹ء، ۱۶-۱۱۰، بحث پر طلقائے مگر جو خالص اموی دشمنی پر مبنی اور غلط ہے۔
[7] ابوداؤد، سنن، کتاب الجہاد، باب فی الدابۃ تعرقب فی الحرب (۳/۲۹)، حضرت

ابن زبیر کی ولادت کے لیے ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب الاشراف اول ۲، ۲ جس کے مطابق وہ اور حضرت نعمان بن بشیر خزرجی انصار میں اول مولودین تھے، نیز ابن سعد، ہشتم ۹۲-۱۹۱ ملاحظہ ہو۔ فخر الحسن گنگوہی، التعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد، مطبع نامی کانپور، غیر مورخہ، اول ص ۳۲۶ [8] ابن ماجہ، کتاب تعبیر الرویا، باب تعبیر الرویا (۲/ ۱۲۹۳)، ابن سعد، ہشتم ۷۹-۲۷۸ نے اس مسئلہ پر دو روایات دو سندوں سے نقل کی ہیں [9] قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعلمین، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء، دوم، ۱۱۳، نیز ۹۶ اور حواشی ص ۳-۲۰۲۔ قاضی موصوف نے ابن سعد، ہشتم، ۲۲۰ سے یہ بیان لیا ہے لیکن اس میں یہ فرق ہے کہ حضرت سلمیٰ مشہور دایہ/ قابلہ تھیں اور انہوں نے ہی حضرت خدیجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولادوں کی پیدائش میں دایہ کے فرائض انجام دیے تھے اور اس سے قبل بھی ممتاز تھیں۔ وہ حضرت ابراہیم کی بھی دایہ تھیں [10] مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان الخ (۴/ ۸-۱۸۰۷) قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمۃ للعلمین، دوم، ۹۶، قاضی صاحب نے ابن سعد، ہشتم، ۴۳۶ سے یہ روایت لی ہے، جس میں ہے: وھی التی ارضعت ابراھیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز ملاحظہ ہو: بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا بک لمحزونون، کتاب الادب، باب من سمی باسماء الانبیاء، ابن سعد، اول، ۷-۱۳۶ [11] مالک بن انس، موطا، کتاب الجامع، الرقیۃ من العین (۳/ ۲۰-۱۱۹) [12] مالک بن انس، موطا، کتاب الرضاعۃ، رضاعۃ الکبیر (۲/ ۱۶-۱۱۵/ نیز ۲/ ۱۸-۱۱۷) نیز ملاحظہ ہو: مسلم، کتاب الرضاعۃ، باب رضاعۃ الکبیر (۲/ ۸-۱۰۷۶)، باب انما الرضاعۃ من المجاعۃ (۲/ ۷۹-۱۰۷۸)، ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فیمن حرم بہ (۲/ ۲۲۳)،

باب فی رضاعۃ الکبیر (۲/ ۲۲۲)۔ رضاعت کی حرمت اور رضاعت کبیر پر علماء کے مسالک اور حضرت عائشہ کے فتوے کے لیے مزید ملاحظہ ہو: ابن کثیر، تفسیر اول ۸۳-۲۸۲۔ حضرت سہلہ بنت سہیل عامری کے سوانح، رضاعت حضرت عائشہ کے فتوے اور اس کے شاذ ہونے کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سعد، ہشتم ۷۱-۲۷۰ [13] بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف (۵/ ۱۶ اور ۵/ ۱۱۶) نیز ملاحظہ ہو: ابن اثیر، اسد الغابہ، طہران طباعت سوم ۲۸۱، ۳۲۶، پنجم ۲۱۱ کے مطابق حضرت ابو نائلہ کا اسم گرامی سعد بن سلامہ بن وقش تھا اور وہ بنو عبد الاشہل/ اوس کے فرد تھے، سلکان ان کا لقب تھا مگر اپنی مذکورہ بالا کنیت سے معروف تھے، غزوہ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شرکت کی اور خلافت فاروقی میں جنگ جسر میں شہید ہوئے، ان کے اصل نام میں اختلاف ہے۔ رضاعت اور قتل کعب میں شرکت کا ذکر کیا ہے مگر رضاعی ماں کا حوالہ نہیں ہے۔ ابن حجر، الاصابہ، چہارم ۹۵-۱۹۴ اور ابن عبد البر، الاستیعاب بر حاشیہ اصابہ ۱۹۵ نے بھی یہی معلومات کم و بیش دی ہیں [14] ابن سعد، ہشتم ۴۶۲، حضرت ام کلثوم حضرت ابوبکر صدیق کی انصاری بیوی حضرت حبیبہ بنت خارجہ بن زید خزرجی کے بطن سے تھیں اور ان سے حضرت ابوبکر صدیق نے ہجرت کے بعد شادی کی تھی۔ حضرت ام کلثوم کی ولادت بعد میں ہوئی تھی اور یہ واقعہ رضاعت ابتدائی اموی عہد کا ہے۔ حضرت سالم کی ولادت ۵۸ھ سے پہلے ہوئی ہوگی جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں۔ ابن سعد، پنجم ص ۲۰۱-۱۹۵ کے مطابق حضرت سالم کی ماں ایک باندی (ام ولد) تھیں، مگر ان کی ولادت وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ تاریخ وفات آخر ذوالحجہ ۱۰۶ھ دی ہے، ان کے لیے ملاحظہ ہو: ابن حجر، تہذیب التہذیب، سوم ص ۴۳۶ تہذیب ابن عساکر ششم ص ۵۵ وغیرہ نیز زرکلی، الاعلام، سوم ص ۷۱ [15] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کے اسباب میں [illegible] آپ کی ولادت اور بنو سعد بن بکر میں آپ کی رضاعت

کو اہم ترین گنا یا جاتا ہے۔ علامہ شبلی، سیرۃ النبی اول ۲، ۱۷۲، حاشیہ ۲ میں امام سہیلی کے حوالہ سے اسے لکھا ہے اور دوسرے متعدد سیرت نگاروں نے بھی۔ حضرت ابو سفیان بن حارث ہاشمی قادر الکلام اور فصیح بلیغ شاعر تھے جن کا لوہا سب ہی مانتے تھے۔ ملاحظہ ہو: ان کا سوانحی خاکہ ابن اثیر، اسد الغابہ، پنجم ۲۱۳، جس میں ہے: "کان ابو سفیان من الشعراء المطبوعین" انہوں نے اسلام کی مخالفت میں آپ کی ہجو بھی کی تھی جسے انہوں نے اپنی توبہ اسلام اور نعت سے دھو دیا تھا ۱۶ لیکن شبلی نعمانی کا یہ بیان کہ "اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے روسا اور شرفاء شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے ... ولید بن عبد الملک خاص اسباب سے نہ جاسکا اور حرم شاہی میں پلا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنی امیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا" (بحوالہ ابن اثیر پنجم ۴) بحث طلب ہے۔ اسی قسم کی بحث دوسرے سیرت نگاروں کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جو بقول شبلی گرامی "روایت پرستی" پر مبنی ہے حالانکہ اس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسئلہ مزید بحث کا متقاضی ہے۔ جس کی یہاں گنجائش نہیں ۱۷ علامہ شبلی نعمانی، اول ۱۷۳، حاشیہ ۲ یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا اس بنا پر عرب میں مثل ہے: الحرۃ لا تاکل بثدییھا اسی بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال مکہ میں قحط پڑا تھا الخ ۱۸ بچیوں (بنات) کی رضاعت کی جو روایات اب تک ملی ہیں ان سے زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہری علاقوں تک محدود رہی تھیں، لیکن حضرت عائشہ، حضرت حفصہ وغیرہ کی رضاعت کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو شہر سے باہر دیہات میں بھیجا گیا تھا۔ بہر کیف اس مسئلہ پر مزید تحقیق دلچسپ اور اہم نکات روشنی میں لائے گی۔

عہد اسلامی میں کتبخانوں کا قیام و ارتقاء

ترجمہ طلحہ ایوب اصلاحی

علم و تعلیم سے مسلمانوں کو ہمیشہ غیر معمولی شغف رہا ہے اس لیے شروع ہی سے انکی توجہ کتب خانوں کے قیام و ترقی کی جانب بھی مبذول رہی ہے اسلامی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ان کے اغراض و مقاصد میں بھی تنوع و وسعت پیدا ہوتی رہی، ابتدا میں ان کا قیام عام مساجد خصوصاً جامع مسجد میں عمل میں آیا جن کے ساتھ اس زمانے میں درسگاہیں بھی ہوتی تھیں، لیکن بعد میں مدارس کی الگ عمارتیں بننے لگیں تو ان کے اور اسپتالوں کے ساتھ بھی لائبریری قائم ہونے لگی۔ شروع میں عموماً کتب خانے دو طرح کے ہوتے تھے ایک سرکاری جن کو خلفاء و سلاطین اور ان کے امراء و حکام اور قضات کی سرپرستی حاصل ہوتی تھی اور دوسری طرح کے کتب خانے ذاتی ہوتے تھے جو اصحاب علم و فن کی کوششوں کا نتیجہ ہوتے تھے،

اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلامی دور میں لائبریری کا وجود و ارتقاء مسجدوں کا رہین منت ہے۔ اس لیے ان دونوں کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایک مدت تک مسجدیں ہی اسلامی علوم کی تدریس کا مرکز تھیں۔ لوگ اسلامی عقائد و تعلیمات کو سیکھنے کے لیے حرم مکی اور مسجد نبوی اور مفتوحہ علاقوں کی دیگر بڑی مسجدوں میں جمع ہوتے تھے۔ ایک عالم مسجد کے کسی گوشہ میں بیٹھ جاتا جس کے ارد گرد طلبہ حلقہ زن ہو جاتے تھے۔

معلم اسلام کی تعلیمات پر لکچر دیتا اور طلبہ انہیں قلم بند کر لیتے اور محفوظ رکھتے۔ انہیں لکچروں کو شاگردوں نے مرتب کر کے کتاب کی شکل دے دی اور اساتذہ کے نام سے شایع کر دیا۔ یہی کتابیں امالی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ حاجی خلیفہ نے اپنی مشہور کتاب "کشف الظنون" میں امالی کے لیے ایک الگ باب ہی مختص کر دیا ہے۔ جو کتابیں "امالی" کے نام سے جانی جاتی ہیں ان میں مشہور القالی، ثعلب، الزجاج، ابن درید اور بدیع الزماں الہمدانی کی امالی ہیں[1]۔

دوسری صدی ہجری کو تدوین علوم کی صدی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا آغاز حدیثوں کی تدوین سے ہوتا ہے جن کی جمع و تدوین کو اولیت دی گئی۔ اس کے بعد مغازی وسیر کی کتابوں کی تدوین پر توجہ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں علماء نے قرآن وحدیث کو اپنے مطالعہ، درس وتدریس اور جمع و ترتیب کا خاص موضوع بنایا۔ اسکے بعد دیگر اسلامی اور عربی علوم کی جمع وتدوین کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور میں متنوع موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کو مرتب کرنے والوں نے ماخذ کی نشاندہی کی اور راویوں کے حالات وواقعات بیان کیے بلکہ ان کے حالات پر باقاعدہ مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں تاکہ رواۃ کی ثقاہت کو پرکھا جا سکے۔

دوسری صدی ہجری میں مختلف علوم کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے پر بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ ابن جلجل اپنی "طبقات" میں لکھتا ہے کہ طب میں اہرام ابن اعیان کے کام کو مروان بن حکم کے زمانے میں عربی میں منتقل کیا گیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو عوام کے لیے جاری کیا[2]۔ اسی کے ساتھ اسلامی علوم کی مختلف شاخوں میں بھی

[1] عبدالستار الحلوجی، لمحات من تاریخ الکتب والمکتبات، ص ۳۳ [2] طبقات الاطباء والحکماء ص ۶۱۔

کتابیں منظر عام پر آئیں۔ چونکہ اس دور میں عام طور پر کتابیں مساجد کے حلقہ ہائے درس کے نتیجہ میں وجود میں آئیں، اس لیے کتب خانوں کا قیام بھی پہلے مسجدوں ہی میں عمل میں آیا۔ کیونکہ اسلام میں مساجد کی حیثیت صرف عبادت خانہ کی نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کی دعوت واشاعت کا مرکز بھی ہوتی تھیں اور ان میں مسلمانوں کے اجتماعی اور اہم امور ومعاملات پر غور وخوض بھی ہوتا تھا، اس طرح انہیں بڑی مرکزیت اور اہمیت حاصل تھی

مسلمانوں میں اس کا عام رواج تھا کہ وہ ان کتب خانوں میں قرآن مجید کے نسخے، حدیث، فقہ اور عقائد کی کتابیں ہدیہ کرتے تاکہ مسجدوں میں آنے والے جن لوگوں کو علمی شغف ہو وہ ان کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔ گویا جس طرح مساجد کی حیثیت عبادت خانہ کی تھی اسی طرح وہ مطالعہ گاہ کی حیثیت بھی رکھتی تھیں۔ مساجد میں تعلیم کا عمل پانچویں صدی ہجری کے وسط تک جاری رہا اس کے بعد مدارس اور درسگاہوں کی مستقل عمارتیں بننے لگیں اور مساجد کی یہ حیثیت برقرار نہ رہ سکی۔ مساجد کے کتبخانے میں نادر کتابوں اور بیش قیمت مخطوطات کا ذخیرہ تھا اس کی وجہ سے ان کا فیض نہایت عام تھا اور ان کو اہم دانش گاہوں اور علمی مرکزوں کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور ان کی علمی سرگرمیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ پوری دنیا سے طلبہ واساتذہ اور تشنگان علم وتحقیق ان علمی مرکزوں کی جانب کھنچ کر آتے تھے۔ درس وتدریس کے حلقے یوں تو تمام بڑی مسجدوں میں قایم تھے، لیکن خاص طور سے مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصی اور دیگر اسلامی ملکوں کی اہم مساجد جیسے قاہرہ میں الازہر، دمشق کی مسجد اموی اور بغداد، اندلس، تونس اور مراکش کی اہم مساجد میں بھی حلقہ ہائے درس

قایم ہوتے تھے۔

ان مساجد کے کتب خانوں میں مختلف موضوعات کی اہم کتابوں کا جو ذخیرہ ہوتا تھا ان کی حسب ذیل دو نوعیتیں ہوتی تھیں۔

(۱) وہ کتابیں جن کو علما و محققین وقف کر دیتے تھے (۲) ایسی کتابیں جو محققین و فضلا کی جانب سے ہدیہ کی جاتی تھیں۔ بعض علماء اپنی کچھ کتابیں یا پوری لائبریری اپنے قصبہ یا گاؤں کی مسجدوں میں وقف کر دیتے تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابو نصر احمد بن یوسف السلیکی المنازی (المتوفی ۴۳۷ھ/۱۰۴۵ء) کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جن کو انہوں نے جامع میافارقین اور جامع آمد میں وقف کر دیا۔ ابن خلکان کے زمانے تک یہ کتابیں ان دونوں مسجدوں کے کتاب خانے میں محفوظ رہیں اور منازی کے کلکشن کی حیثیت سے جانی جاتی تھیں[۱]۔ اکثر مسلم حکمراں بھی بہت سی قیمتی اشیاء رضائے الٰہی کے حصول کے لیے مسجدوں میں ہدیہ کرتے تھے جن میں کتابیں بھی ہوتی تھیں۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ جب اس نے ۶۱۶ھ مطابق ۱۲۱۹ء میں 'مرو' کو خیرباد کہا تو اس وقت اس شہر میں دس وقف لائبریریاں تھیں جن میں اس وقت نادر کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا۔ ان میں سے دو مرکزی مسجد میں تھیں اور ہر ایک میں کتابوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی[۲]۔

بہت سے عرب ملکوں میں مساجد سے ملحق کتب خانوں کا سلسلہ آج بھی برقرار ہے، مثال کے طور پر مکہ مکرمہ میں "مسجد حرام"، مدینہ منورہ میں "مسجد نبوی"، قاہرہ میں

[۱] وفیات الاعیان و انباء الزمان، تحقیق محی الدین عبد حامد، مکتبۃ النہضۃ المصریہ، قاہرہ حصہ اول ص ۱۳۶ [۲] معجم البلدان، جلد ۴، ص ۵۰۹۔

"جامع الازہر"، دمشق میں "جامع بنی امیہ"، تیونس میں "جامع الزیتونۃ" اور "جامع المنصور" بغداد میں "جامع المنصور"، مسجد قرطبہ، طلیطلہ، بلاد المغرب اور صنعاء کی الجامع الکبیر ان میں سے ہر مسجد کے پاس ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں مختلف موضوعات پر بیش قیمت مطبوعہ مواد کے ساتھ نادر مخطوطات بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مساجد میں قایم یہ کتب خانے سیکڑوں برس پہلے قایم ہو چکے تھے اور ان کی اکثر کتابیں حکمرانوں اور علما کا عطیہ ہیں جن کی تعداد میں وقت گزرنے کے ساتھ برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ بعض اہم مساجد میں ایک سے زیادہ کتب خانے تھے۔ یاقوت حموی لکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں 'مرو' کی "الجامع الکبیر" میں دو کتب خانے تھے۔ ان میں سے ایک "العزیزیہ" کے نام سے موسوم تھا، جو ایک شخص عزیز الدین ابوبکر کے نام سے منسوب تھا۔ اس میں بارہ ہزار کتابیں تھیں۔ یاقوت مزید لکھتا ہے کہ دوسری لائبریری "الکمالیہ" کے متعلق مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کس کی جانب منسوب ہے[۱]۔

یہ کتب خانے مختلف اوقات میں چوری، غارت گری، آتش زدگی اور سیلاب کی زد میں آکر بھاری نقصان سے دوچار بھی ہوتے رہے، بعض کتب خانوں کی زیادہ تر کتابیں بالکل تباہ ہو گئیں۔

مسجد کے علاوہ ذاتی کتب خانوں (PRIVATE LIBRARIES) کا وجود بھی شروع ہی سے ملتا ہے۔ جو صحابہؓ، تابعین، خلفاء، حکمراں اور وزراء کے گھروں میں ہوتی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سعد بن عبادہؓ انصاری کے پاس ایک یا ایک سے زیادہ کتابیں تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل تھیں[۲]۔ اسی طرح

[۱] یاقوت الحموی، معجم البلدان جلد ۸، ص ۳۵ [۲] اصول الحدیث، ص ۱۶۹ بحوالہ جامع بیان العلم جلد ۱، ص ۷۲۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ان کے مشہور صحیفہ کے علاوہ چند مزید صحیفے تھے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ عمیس کی بیٹی اسماء کے قبضہ میں ایک کتاب تھی جس میں انہوں نے چند احادیث جمع کر رکھی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ احادیث پر مشتمل بہت سی کتابوں کے مالک تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اپنی کتابوں اور صحیفوں کو زبانی یاد کرتے تھے اور انہیں ایک مقفل صندوق میں رکھتے تھے۔ اس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے دست تصرف میں بہت زیادہ کتابیں تھیں جن کا وزن ایک اونٹ کے بوجھ کے بقدر تھا۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کتابوں کی ایک بڑی تعداد کے مالک تھے۔ ان میں زیادہ تر بہت ہی اعلیٰ اور نادر کتابیں تھیں۔ اسی طرح عروہ بن زبیر کے پاس بھی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جو حرۃ کی جنگ کے موقع پر نذر آتش ہوگیا۔ اس نقصان عظیم کا انہیں بے حد ملال تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری خواہش تھی کہ میں اپنی کتابوں کو اپنے خاندان کے لیے بطور سرمایہ چھوڑ جاؤں گا۔[2]

مشہور تابعی ابو قلابہ عبداللہ بن زید نے اپنی کتابیں ایوب السختیانی کو دینے کی وصیت کی تھی۔ جب وہ کتابیں لائی گئیں تو ان کا وزن ایک اونٹ کے برابر تھا۔ حسن بصری کا کہنا تھا کہ "بعض لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ وہ ان کتابوں کی حفاظت ضرور کریں گے۔"[3] بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد میں ایسے شوقین اور علم کے جویا افراد

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۱۶ [2] حوالۂ سابق، ص ۱۳۳ [3] الحجاج الخطیب، المکتبہ والبحث والمصادر، ص ۳۲، نیز دیکھئے عبدالرحمن عمیرۃ، اضواء علی البحث والمصادر، ص ۸۱۔

بڑی تعداد میں پیدا ہوگئے تھے جنھوں نے اپنے آپ کو مختلف علوم اور زبانوں کی کتابوں کے جمع و تحفظ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان میں ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ جن کے پاس کتابوں کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ انہوں نے گھر میں اپنے آپ کو مطالعہ کے لیے مقید کر رکھا تھا اور ہمیشہ کتابوں کے درمیان گھرے رہتے تھے۔ کتابوں کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف و اشتغال کی بنا پر ایک روز انکی بیوی یہ کہنے کے لیے مجبور ہوگئیں کہ "میں تین سوکنوں کو آپ کی کتابوں کے ساتھ محبت کے مقابلے میں ترجیح دوں گی۔"[1] ایک دوسرے اسکالر ابو عمرو بن العلاء (۷۰-۱۵۴ھ) کے پاس نہ صرف یہ کہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا بلکہ وہ خود متعدد کتابوں کا مصنف بھی تھا۔[2]

جابر بن حیان (متوفی ۲۰۰ھ) اور امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کے پاس مختلف علوم کی کتابوں پر مشتمل کتبخانے تھے۔ احمد المدنی (متوفی ۲۷۲ھ) کے پاس بھی بہت زیادہ کتابیں تھیں۔[3] ابوبکر رازی (متوفی ۳۱۱ھ) کے پاس کتابوں سے بھرے بہت بڑے بڑے بکس تھے۔ محمد بن نصر الحاجب (متوفی ۳۱۲ھ) بھی مختلف علوم و فنون کی بہت زیادہ کتابوں کے مالک تھے۔[4] ابوبکر الصولی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک بڑا مکان تھا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔

بنو مروان کے پاس ایک لائبریری تھی جس کی کتابوں کی صرف فہرست ۴۴

---

[1] ابن خلکان، وفیات الاعیان، جلد: ۳، ص ۳۱۷ [2] الجاحظ، البیان والتبیین، جلد: ۱ ص ۳۲۱ [3] الاصفہانی ابونعیم، اخبار اصبہانی، (لیڈن، بریل، ۱۹۳۱ء) ص ۸۵ [4] عرب القرطبی، صلۃ تاریخ الطبری (المکتبۃ التجاریۃ قاہرہ ۱۹۳۹) ص ۸۴۔

جلدوں میں تھی۔ ان میں سے چند جلدیں صرف دواوین کی فہرست پر مشتمل تھیں [1]

مذکورہ بالا لائبریری جس کی فہرست ۴۴ جلدوں میں تھی اموی خلیفہ حکم دوم نے قائم کی۔ اس تاریخی لائبریری کو قایم کرنے اور ذخیرۂ کتب سے مالا مال کرنے میں خلیفہ نے غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے تاجران کتب کو مختلف ملکوں میں کتابیں خریدنے کے لیے بھیجا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کتاب "الاغانی" کو اپنے کتب خانہ کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے مصنف ابو الفرج کو بنی امیہ سے خاندانی نسبت تھی۔ خلیفہ نے خالص سونے کے ایک ہزار دینار ابوالفرج کے پاس بھیجے، اس طرح "الاغانی" کا ایک نسخہ ابو الفرج نے اس شرط کے ساتھ بھیجا کہ وہ عراق کے باہر نہ جائے۔ اس نے اپنی ذاتی لائبریری کو مزید وسیع کرنے اور بہتر حال میں رکھنے کے لیے اپنے محل میں ماہر نسخہ نویس، تربیت یافتہ منشی اور تجربہ کار جلد ساز کی ایک قابل لحاظ تعداد کو ملازم رکھا [2]

یاقوت حموی کا بیان ہے کہ الصاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ) کی لائبریری میں چھ ہزار دو سو کتابوں کی جلدیں تھیں۔ تنہا اس کی فہرست دس حصوں میں تھی [3] جب کہ العزیز الفاطمی کی لائبریری میں ۱۶ لاکھ کتابوں کی جلدیں تھیں [4] وزیر مہلبی کی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ ۱۷ ہزار تھی، اسی طرح اسامہ بن منقذ کے پاس چار ہزار کتابیں تھیں جو ایک حملہ میں لوٹ لی گئیں۔ اس المناک حادثہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ کہا "ان کتابوں کا ضیاع ہی در اصل میری مغموم زندگی کا

۱ نفح الطیب جلد: ۱، ص ۳۶۲ ۲ حوالہ سابق، جلد: ۱، ص ۳۶۲ ۳ یاقوت، معجم الادباء جلد: ۶، ص ۲۵۹ ۴ میرے خیال میں یہ تعداد مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔

اصل سبب ہے۔ ابن سینا القفطی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اس نے بخارا کے سلطان نوح بن منصور سے درخواست کی کہ اسے اجازت دی جائے کہ وہ لائبریری کے مشتملات سے متعلق معلومات حاصل کر سکے۔ وہ لکھتا ہے کہ القفطی کی درخواست قبول کر لی گئی لیکن لائبریری کی وسعت کا یہ حال تھا کہ وہ صدر اول کی کتابوں کی فہرست لے کر وہاں گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ اسے کس کتاب کی ضرورت ہے [1]

۷۲۸ھ میں علامہ ابن تیمیہؒ کو ان کی بیماری کے سبب لکھنے سے بالکل منع کر دیا گیا اور یہی مرض الموت بھی بنا۔ چنانچہ تمام کتابیں، کاغذ، دوات اور قلم ان کے پاس سے ہٹا دیے گئے [ع] لیکن انہوں نے اس بیماری سے پہلے اتنا زیادہ تحریری مواد چھوڑا تھا کہ ان کی کتب و رسائل کی تعداد ایک سو تک پہنچتی ہے جو سب کتب خانہ "العادلیہ" کے حوالہ کر دیا گیا۔ مورخ علم الدین البرزالی کے مطابق ان کی تعداد ۶۰ جلدوں پر مشتمل تھی [2]

ع معارف: یہ سہو بیان ہے اصل واقعہ یہ ہے کہ جب امام صاحب قید ہوئے تو قید خانہ میں نہایت اطمینان سے تصنیف و تالیف شروع کی، جس مسئلہ پر علامہ کو سزا دی گئی اس کے متعلق مفصل مضامین لکھے، احباب اور اہل فتویٰ کو خطوط اور فتویٰ بھی لکھتے رہتے تھے، یہ تحریریں ملک میں پھیلیں تو رفع فساد کے لیے حکم دیا گیا کہ علامہ کے پاس قلم دوات وغیرہ کوئی چیز نہ رہنے پائے، اس کے بعد علامہ نے جو سب سے آخر تحریر لکھی وہ چند سطریں تھیں جن کا مضمون یہ تھا کہ مجھکو اگر اصلی سزا دی گئی تو وہ یہ ہے، اسکے بعد بیمار ہوئے اور بالآخر انتقال کر گئے (مقالات شبلی حصہ پنجم ص ۵) امام صاحب کے سیرت نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب انکے قلم دوات لے لیے گئے تو انہوں نے منتشر اوراق پر کوئلہ سے لکھنا شروع کیا، انکے متعدد رسائل اور تحریریں کوئلہ سے لکھی ہوئی ملیں اور عرصہ تک اسی حالت میں محفوظ رہیں (تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم ص ۱۱۵)

۱ صلاح الدین المنجد، قواعد فہرسۃ المخطوطات العربیۃ ص ۱۷ ۲ یاقوت حموی معجم الادباء جلد: ۶، ص ۲۵۹

مشہور مورخ اور "کتاب الروضتین" کے مولف ابو شامہ نے اپنی پوری لائبریری "عادلیہ لائبریری" کو وقف کر دینے کی وصیت کی تھی۔ اس کی لائبریری میں مختلف اسلامی موضوعات پر کتابوں کا بہت اہم ذخیرہ تھا۔[1]

التاج الکندی کا شمار دمشق کے اہم اصحاب علم و دانش میں ہوتا تھا۔ وہ ماہر لسانیات تھا۔ نثر و نظم دونوں ہی میں یکتا تھا وہ بہت سے ایوبی سلاطین کا معلم و اتالیق (TUTOR) رہا۔ خاص طور سے امجد بہرام شاہ، عزالدین فرخ شاہ اور ملک المعظم عیسیٰ اس کے سایۂ تعلیم و تربیت میں رہے۔ اس نے بنوامیہ کی مسجد المقصورۃ التاجیہ کے ایک حجرہ میں درس دینا شروع کیا۔ یہ حجرہ مسجد کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ اس حجرہ میں ایک پبلک لائبریری بھی تھی۔ ابو شامہ کو تاج کندی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس لائبریری کی ایک فہرست ملی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری ۷۶۱ کتابوں پر مشتمل تھی۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

(الف) قرآنی علوم، تفسیر اور تجوید	۱۴۰ جلدیں
(ب) علوم حدیث اور مصطلحات حدیث	۱۹ "
(ج) فقہ اور اصول فقہ	۳۹ "
(د) عربی زبان وادب	۱۴۳ "
(ہ) شاعری اور بلاغت و معانی	۱۲۲ "
(س) نحو و صرف	۱۷۵ "
(ہ) طب قدیم	۱۲۳ "
کل تعداد	۷۶۱

[1] یاقوت حموی، معجم الادبا، ج ۱۲ ص ۱۷۔ نیز دیکھئے ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد: ۱۴، ص ۱۳۴۔

لائبریری کی کئی فہرستیں ہیں جن میں وہ تمام کتابیں درج ہیں جو مختلف اوقات میں حاصل ہوتی رہیں۔[1]

علماء، فقہاء اور ادباء کے علاوہ خلفاء، سلاطین اور اہل ثروت کے محلوں میں انکے ذاتی کتب خانے تھے جن کی وہ مالی سرپرستی کرتے تھے۔ لائبریری قایم کرکے وہ اپنے ملک اور خاندان کو تعلیم و تہذیب کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ان کے خاندان، اعزا، علم دوست احباب اور اس علاقے کے محققین اور علم کے شائقین کو استفادہ کا موقع ملتا تھا۔

کتب خانوں کے مالکوں کی وفات کے بعد ان کے ورثا ان کے مالک ہوتے تھے یا وہ ان کے سرکاری جانشین کے قبضہ میں آجاتے تھے۔ بعض حالات میں یہ کتب خانے مسجدوں کی یا پبلک اور اسکولوں کی لائبریریوں میں ضم کر دیے جاتے تھے۔ کبھی متوفی عالم کی جمع کی ہوئی کتابوں کو ورثا نے تاجران کتب کے ہاتھوں فروخت بھی کر دیا ہے اور دوسرے کتب خانے والے یا علم دوست حضرات نے تاجران کتب سے ان قیمتی کتابوں کو خرید کر اپنے کتب خانوں کو مالا مال کیا۔

اسلامی فتوحات میں توسیع کے ساتھ فاتحین کو مفتوحہ علاقوں میں مختلف موضوعات پر اہم اور قیمتی کتابوں کے ذخیرے ہاتھ لگے۔ انہوں نے ان کتابوں کو محفوظ کر لیا۔ علماء نے ان کا مطالعہ شروع کیا اور ان کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا انتظام کیا۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اوریجنل کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام بھی بہت تیزی سے شروع ہوا اس کے نتیجے میں مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجموں اور طبع زاد تصانیف کا

[1] صلاح الدین المختار ص ۱۶ - ۱۸۔

انبار لگ گیا۔ خلفاء اور سلاطین نے اس کام میں بڑی دلچسپی لی اور علماء و مترجمین کو انکے کارناموں کے عوض بیش بہا انعام و اعزاز سے نوازا۔ بعض حکمرانوں نے مصنفین کی کتابوں کے برابر سونا وزن کرکے انہیں دیا۔ اس طرح ان علماء اور مصنفین کی خوب حوصلہ افزائی ہوئی اور اپنے کارناموں کی وجہ سے انہیں عالم اسلام میں غیر معمولی شہرت ملی۔ اس طرح ایک علمی تحریک وجود میں آگئی۔ علماء اور دانشوروں میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا اور علم کی روشنی چہاردانگ عالم میں پھیل گئی۔ کتابوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ مزید پبلک اور ذاتی لائبریریاں قائم ہوئیں بلکہ اسلامی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں ان کو قائم کرنے کے لیے مقابلے ہونے لگے۔ اس طرح خلفاء، علماء، فقہاء اور مصنفین مسجدوں، محلوں، مکانوں، اسکولوں اور ساحلی علاقوں میں لائبریریاں قائم کرنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ کتب خانوں کی دیکھ بھال کے لیے ایسے افراد مقرر کیے گئے جو کتابوں کے موجودہ ذخیرہ میں مزید اضافہ بھی کرسکیں۔ کتب خانوں کے فائدے کو مدنظر رکھ کر خلفاء و سلاطین اور اہل ثروت حضرات نے ان کو مستقل امداد دینی شروع کردی۔ یہیں سے لائبریری کی ایک نئی قسم کا وجود ہوتا ہے جسے پبلک لائبریری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لائبریری کی یہ قسم اس حیثیت سے مساجد اور ذاتی کتب خانوں سے مختلف تھی کہ سرکاری امداد کی وجہ سے اس کے پاس جگہ بھی زیادہ تھی اور اس میں کتابیں بھی زیادہ ہوتی تھیں۔

پبلک لائبریری کا وجود مساجد لائبریری اور ذاتی لائبریری کے ساتھ ہی عمل میں آگیا تھا۔ اس نے بھی دیگر کتب خانوں کی طرح ارتقائی مراحل طے کیے اور علم اور اسلامی تعلیمات کے فروغ میں اہم حصہ لیا۔ اسلام کی علمی میراث کو صدیوں تک محفوظ رکھنے میں

ان لائبریریوں کا بڑا اہم حصہ ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو دمشق میں اموی خلیفہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں "بیت الحکمۃ" کے نام سے پہلی پبلک لائبریری قائم کی۔ یہ لائبریری بہت بڑی عمارت میں تھی اور اس میں کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس اموی خلیفہ کے جانشین خالد بن یزید بن معاویہ نے ایک مخصوص طرز کی پبلک لائبریری قائم کی۔ جس میں بہت زیادہ کتابیں تھیں۔ کیمیا کی کتابوں کو جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اس لیے کہ خالد بن یزید کو اس سے خود دلچسپی تھی۔ اس موضوع سے دلچسپی کی وجہ سے اس نے کیمسٹری کی کتابیں بڑی تعداد میں جمع کیں اور ان کے عربی ترجمے کا انتظام کیا۔ اس نے اس کام میں ایک قابل لحاظ رقم صرف کی۔ درحقیقت یہ پہلا شخص ہے جس نے یونانی اور قبطی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کی جانب توجہ منعطف کی[۱]۔ کیمسٹری کی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے بہت سی مترجم کتابیں منظر عام پر آگئیں۔ عباسیوں کے عہد میں خلیفہ منصور (۱۳۶-۱۵۸ھ) کو کتابوں اور لائبریری سے بے حد دلچسپی تھی اس نے بغداد میں "بیت الحکمۃ" کے نام سے بہت بڑی پبلک لائبریری قایم کی۔ یہ اپنے دور کی سب سے بڑی لائبریری تھی۔

خلیفہ ہارون رشید (۱۷۰-۱۹۳ھ) نے "بیت الحکمۃ" کو مزید ترقی دی اور منصور کے علمی کاموں میں قابل لحاظ اضافہ کیا۔ اس نے اس میں مؤلف اور مترجم اور دیگر زبانوں کی کتابوں کو شامل کیا۔ جن میں سے بیشتر کو روم کے مفتوحہ علاقوں اور ایشیا کے بازاروں سے حاصل کیا تھا۔ اس نے اپنی حاصل کردہ تمام کتابوں کو

۱۔ ابن الندیم، الفہرست۔ ص ۴۹۷-۴۹۸۔

بیت الحکمۃ میں شامل کر دیا تاکہ علما، فقہا اور دوسرے اہل علم حضرات کو اس سے بخوبی
استفادہ کا موقع مل سکے۔ علاوہ بریں خلیفہ ہارون رشید نے تالیف و ترجمہ کے کام
کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے لیے اس نے اعزازات و انعامات جاری کیے
خلیفہ کا یہ طرز عمل مختلف میدانوں میں علمی سرگرمیوں میں مزید اضافہ کا سبب بنا۔

خلیفہ مامون (۱۹۳-۲۱۸ھ) کے دور میں کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے کام
میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے مختلف ملکوں سے کتابیں حاصل کیں اور انہیں عربی میں
ترجمہ کے لیے مترجمین کا تقرر کیا[1] واقعہ یہ ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں
کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے کام نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہی زمانہ
کاغذ کی صنعت کے وجود و توسیع کا بھی ہے۔ اس میں کاغذ کی صنعت نے بہت تیزی
سے ترقی کی اور لوگ کتابوں کی نقلوں اور کاپیاں تیار کرنے میں لگ گئے۔ اس طرح
ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو "وراق" کہلاتا ہے۔

ابن خلکان کے مطابق عام طور پر "وراقون" کا کام کتابوں کو نقل کرنا،
ان کی تصحیح اور جلد سازی تھا۔ ہمارے زمانے میں اس کو طباعت اور جلد سازی
کی صنعت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس نئی صنعت کے لیے بغداد میں وراقوں کا
ایک بہت بڑا بازار ہو گیا تھا جہاں سو سے زیادہ کاغذ کی دکانیں تھیں۔ یہ دکانیں
نہ صرف یہ کہ نقل نویسی اور جلد سازی کا مرکز تھیں بلکہ یہ علما اور شعراء کے لیے
کانفرنس ہال کا کام بھی دیتی تھیں۔ نیز یہیں شہر کے معزز لوگ جمع ہوتے اور

[1] صلاح الدین المنجد، قواعد فہرستۃ المخطوطات العربیۃ (دار الکتاب الجدید، بیروت ۱۳۹۶ھ) ص ۱۳۔

دنیا میں شایع ہونے والی نئی کتابوں کے بارے میں ایک دوسرے سے معلومات حاصل
کرتے۔ انہیں دکانوں پر مختلف علمی موضوعات پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا تھا۔

اس زمانے کے اہم علما اور مصنفین میں سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف امام
شافعی (م ۲۰۴ھ) تین سو کتابوں کے مؤلف و مرتب جابر بن حیان (م ۲۰۰ھ) ایک سو
بیس کتابوں کے مصنف جاحظ، دو سو پچاس کتابوں کے مصنف محمد بن زکریا الرازی
(م ۳۱۱ھ) کا شمار ہوتا ہے[1]

عہد اسلامی میں لائبریری کا تذکرہ کرتے ہوئے "صبح الاعشیٰ" کا مصنف القلقشندی
لکھتا ہے "ابتدائی زمانہ میں خلفاء اور سلاطین نے کتابوں کو جمع کرنے میں بے حد دلچسپی
کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑے بڑے کتب خانے قایم ہو گئے۔ کہا جاتا
ہے کہ اس وقت اسلامی دنیا میں تین بڑی لائبریریاں سمجھی جاتی تھیں۔

پہلی مشہور لائبریری عباسی خلفا کی قایم کردہ "بیت الحکمۃ" تھی۔ اس میں بے شمار
قیمتی کتابیں تھیں۔ یہ لائبریری ۶۵۶ھ میں بغداد پر تاتاری حملہ تک باقی رہی جس میں
آخری عباسی خلیفہ کو ہلاکو کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور بیت الحکمۃ بھی
اس غارت گری میں نیست و نابود ہو گیا۔

اس وقت کی اسلامی دنیا کی دوسری لائبریری قاہرہ کی "فاطمی لائبریری" اور
تیسری قرطبہ کی "اموی لائبریری" تھی۔ ان تینوں کتب خانوں نے اسلامی ورثہ کے
تحفظ و بقا میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا[2]

[1] عبدالستار الحلوجی، لمحات من تاریخ الکتب والمکتبات ص ۴۳ [2] حوالہ سابق، جلد: ۱، ص ۴۶۶،
نیز ملاحظہ کیجیے عبدالرحمن عیرۃ، ص ۸۱-۸۲۔

اموی اور عباسی خلفاء اور سلاطین کے علاوہ اس زمانے کے دیگر اسلامی ملکوں نے بھی کتابوں کو اکٹھا کرنے اور کتب خانے قایم کرنے میں دلچسپی لی۔ پبلک لائبریریاں "بیت الحکمۃ"، "دارالحکمۃ"، "دارالعلم" اور "خزانۃ الکتب" کے نام سے موسوم کی جاتی تھیں اس دور میں قایم لائبریریوں کی ایک مختصر فہرست بطور مثال ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱۔ بیت الحکمۃ: تیسری صدی ہجری کے آخر میں قیروان میں اغلبیوں نے قایم کی۔

۲۔ دارالحکمۃ: چوتھی صدی ہجری کے آخر میں فاطمیوں نے قاہرہ میں قایم کی۔

۳۔ دارالعلم: القدس میں الحاکم الفاطمی کے ذریعہ قایم کی گئی۔

۴۔ خزانۃ الحکمۃ: اس کو متوکل کے وزیر الفتح بن خاقان نے قایم کیا تھا جسے ۲۴۷ھ میں قتل کردیا گیا۔ ابن ندیم اس لائبریری میں سائنس اور ادب کی کتابوں کا بہترین انتخاب دیکھ کر لکھتا ہے کہ "میں نے ابھی تک جو کتبخانے دیکھے ہیں ان میں یہ سب سے بڑی لائبریری ہے"۔

۵۔ خزانۃ الحکمۃ: اس کے قائم کرنے والے کا نام علی بن یحییٰ المنجم (م ۲۷۵ھ/ ۸۸۸ء) ہے۔ یہ لائبریری قفص کے بالکل سامنے واقع تھی۔ مختلف شہروں سے اہل علم نہ صرف اس کی زیارت کے لیے آتے بلکہ کئی روز قیام کرکے استفادہ بھی کرتے۔

۶۔ دارالعلم: جعفر بن حمدان الموصلی (م ۳۲۳ھ/ ۹۳۴ء) نے موصل میں قائم کی۔ یاقوت حموی اس لائبریری کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کرتا ہے "یہ جملہ علوم کی کتابوں پر مشتمل تھی جو تمام محققین کے لیے وقف تھی۔ اس میں

کسی کے داخلہ پر پابندی نہیں تھی۔ اجنبی کو بھی داخل ہونے کی عام اجازت تھی۔

۷۔ دارالعلم: سابور بن اردشیر نے ۳۸۳ھ میں بغداد میں قایم کی۔ اس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے متجاوز تھی، جس کی مخصوص فہرستیں تیار کی گئی تھیں۔

۸۔ دارالعلم: الشریف الرازی نے قائم کیا۔ ان کی وفات ۴۰۶ھ میں ہوئی۔

۹۔ دارالعلم: بصرہ کے قاضی القضاۃ ابن البقلانی نے قایم کیا۔ ان کی وفات ۴۹۹ھ/ ۱۱۰۶ء میں ہوئی۔

۱۰۔ دارالعلم: بغداد میں ابن المرستانیہ نے قائم کی۔ اس کی وفات ۵۹۹ھ/ ۱۲۰۳ء میں ہوئی۔

۱۱۔ الحکم ثانی کی لائبریری: اسپین کے اموی حکمرانوں نے کتابوں کو جمع کرنے اور ان کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی۔ اس طرح حکم ثانی کی لائبریری اسلامی علوم، عربی زبان، تاریخ، طب اور فلسفہ جیسے موضوعات پر مشتمل نادر مخطوطات کی وجہ سے کافی مشہور ہوئی۔

۱۲۔ نظامیہ لائبریری: پانچویں صدی کے وسط میں لائبریری کی ایک چوتھی قسم وجود میں آئی جسے خصوصی لائبریری (المکتبات المتخصصہ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ابتدا میں اس قسم کے کتب خانوں کا قیام بڑے مدارس اور اہم علمی اداروں میں ہوا۔ اس طرح کی سب سے پہلی لائبریری بغداد کے نظامیہ اسکول میں قایم ہوئی۔ اس کو مشہور سلجوقی وزیر نظام الملک (۱۰۹۲ء/ ۴۸۵ھ) نے قائم کیا تاکہ وہ نئے نظام تعلیم کے تقاضوں اور ضروریات کی تکمیل کرسکے۔ جس کو خود اس نے متعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ کے طرز پر قائم

ہونے والے تمام نئے مدارس کو بھی ایک عمدہ لائبریری مہیا کی گئی، جو نئے نصاب کی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ جب ۵۸۹ھ میں خلیفہ ناصر لدین اللہ نے خلافت کا عہدہ سنبھالا تو اس نے مدارس اور لائبریری کی جانب توجہ دی اور ایسی نادر کتابیں منگوائیں جو آسانی سے نہیں مل سکتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ تنہا اس کی فہرست کی تعداد چھ ہزار جلدوں سے اوپر پہنچتی ہے۔[1]

۱۳۔ خزانۃ المدرسۃ المستنصریۃ: مدرسۃ مستنصریہ کو عباسی خلیفہ المستنصر نے ۶۳۲ھ/۱۲۳۳ء میں بغداد میں قائم کیا۔ جو جدید دور کی یونیورسٹی کے ہم پایہ تھا۔ اس مدرسہ کے پاس بہت بڑی لائبریری تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسکے افتتاح کے وقت اس میں کتابوں کی تعداد اسی ہزار جلدوں سے زیادہ تھی۔[2]

۱۴۔ خزانۃ القاضی الفاضل: اسے صلاح الدین (۵۹۶ھ) کے وزیر قاضی الفاضل نے قائم کیا۔ یہ لائبریری دمشق کے مدرسہ فاضلیۃ میں تھی۔

۱۵۔ خزانۃ المدرسۃ الاشرفیۃ: اس کو الملک الاشرف موسی بن العادل الایوبی (متوفی ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) نے قائم کیا تھا۔

۱۶۔ خزانۃ المدرسۃ العادلیۃ: اس لائبریری کو صلاح الدین کے بھائی العادل (م ۶۱۵ھ) نے دمشق میں قائم کیا۔ اس میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔

۱۷۔ دمشق کے مدارس کے دیگر کتب خانوں کے نام یہ ہیں۔ الشبلیۃ

---

[1] ابن الفوطی، الحوادث الجامعۃ والتجارب النافعۃ فی المائۃ السابعۃ، المکتبۃ العربیۃ ۱۹۳۲ء ص ۵۴
[2] ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، جلد: ۸، ص ۲۲۹۔

البدریۃ، السیفیۃ، التنقیذیۃ، دار الحدیث النوریۃ، دار الحدیث الاشرفیۃ، دار الحدیث الضیائیۃ۔

۱۸۔ مکتبۃ النوریۃ و مکتبۃ الخانقاہ الیساتیۃ: دونوں کتبخانے دمشق میں قایم کیے گئے تھے۔

۱۹۔ مکتبۃ المدرسۃ الفاضلیۃ قاہرہ: اسے قاضی فاضل نے قائم کیا۔ اس نے اس لائبریری کے لیے ایک لاکھ کتابیں جمع کیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد اسلامی کے آغاز ہی سے کتابوں کو اکٹھا کرنے پر خاص توجہ دی گئی۔ نتیجہ کے طور پر پبلک اور پرائیوٹ کتب خانوں کی بہت بڑی تعداد وجود میں آگئی جو بیشتر مساجد، محلات، ذاتی مکانات اور مدارس نظامیہ کے احاطے میں واقع تھے۔ نظام الملک طوسی کے نئے نظام تعلیم کے تحت اسلامی دنیا کے مختلف ملکوں میں قائم کیے جانے والے مدارس نظامیہ کو کتب خانوں کی توسیع میں بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ ان اسکولوں کے کتبخانوں میں قیمتی کتابوں اور نادر مخطوطات کا اہم ذخیرہ ہوتا تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انکے ذخیرۂ کتب میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس طرح علم کا میدان وسیع ہوتا گیا۔ مختلف الجہات موضوعات کو مطالعہ و تحقیق کے لیے منتخب کیا گیا اور اس میدان میں سنجیدہ علمی کاوشیں منظر عام پر آئیں۔ ان علمی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ان کی نشر و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ خاص طور سے مذہب، لسانیات اور انسانی موضوعات پر کتابیں منظر عام پر آئیں۔ کتابوں سے شغف اور پبلک اور پرائیوٹ لائبریریوں کا قیام صرف اموی اور

عباسی دور کا ہی کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ آج تک قایم ہے۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ عالم اسلامی کے طول و عرض میں بڑی اور اہم لائبریریوں کے قیام کی وجہ سے عام لوگ بھی کتابوں سے محبت اور شغف کا اظہار کرنے لگے اور کتابیں خریدنا اور ذاتی لائبریریاں قایم کرنا ایک فیشن بن گیا۔ اس دور میں خلفاء اور شہزادے ترجمہ کی سرگرمیوں میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ کرتے۔ مزید برآں کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان پر نظر ثانی کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ پھر اہم کتابوں کی کاپیاں تیار کرنے کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔ انہیں علمی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی دکانیں کھلنی شروع ہوگئیں۔ یہ دکانیں عباسی سلطنت کے ابتدائی زمانے میں پہلی بار وجود میں آئیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے دارالسلطنت اور مملکت کے تمام بڑے شہروں میں کتابوں کے بازار لگنے شروع ہوگئے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ اسلام نے علم، تقویٰ اور خدا ترسی کی روشنی میں اپنا سفر شروع کیا۔ اس کی مقدس کتاب قرآن مجید نے جو اسلامی قانون کا بنیادی ماخذ ہے، فکر اسلامی کی بنیادیں فراہم کیں۔ اسلامی کتب خانوں نے اسلامی کتابوں کو جمع کرنے کی تحریک پیدا کی اور مختلف اسلامی موضوعات پر اہم اور قیمتی تحقیقات کا موقع فراہم کرکے اسلامی تہذیبی ورثہ کی حفاظت میں زبردست تعاون دیا۔ لیکن جب بربری قبائل اور نوآبادیاتی حملوں میں مسلمانوں کو منگولوں اور صلیبیوں کے ہاتھوں شکست اور تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا تو ان وحشیانہ حملوں کا نشانہ پہلے اسلامی لائبریریاں بنیں۔ ان میں سے بعض لائبریریوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ کچھ دوسری لائبریریوں کو حملہ آور لوٹ کر اٹھا لے گئے، جو لائبریریاں محفوظ

رہ گئیں مستقبل میں ان کی حفاظت اور ترقی پر وہ توجہ نہ دی جاسکی جو ماضی میں دی گئی تھی۔ ایک مدت تک یہ لائبریریاں معطل رہیں لیکن بعد کی دو صدیوں میں ان میں ترقی ہوئی اور استفادہ و افادہ کا سلسلہ جاری ہو سکا۔

اسلامی کتب خانوں کو عام طور سے ان دنوں "خزانۃ الکتب" کے نام سے جانا جاتا تھا، بعد میں "مکتبہ" اور "دار الکتب" جیسے الفاظ کا استعمال شروع ہوا۔ چونکہ ان کتب خانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے لیے فکری غذا فراہم کی۔ نیز رائے عام کو ہموار کرنے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ اس لیے اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کس طرح ان اسلامی کتب خانوں نے انسانی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کیے اور کیوں انہیں اس قدر اہمیت دی گئی۔[1]

اسلامی معاشرہ میں اسلامی کتب خانوں کا کردار چونکہ اسلامی کتب خانے ہی اسلامی علوم کا سرچشمہ تھے اس لیے علوم کی توسیع اور وسیع مذہبی خدمات کی انجام دہی انہیں کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چھوٹی اور بڑی مساجد کے گوشوں میں کتب خانہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس طرح جو بھی مسجد تعمیر ہوتی اس سے ملحق ایک لائبریری ضرور ہوتی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شروع ہی سے تقریباً تمام مسلم ممالک میں مساجد کو تعلیم گاہ کی حیثیت سے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے اور آج بھی ایک حد تک یہ سلسلہ برقرار ہے۔ اوائل اسلام میں مسجدیں مجلس عمل کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں جہاں مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا نیز مساجد ہی میں مختلف تنازعات کے فیصلے ہوتے تھے۔ خاص طور سے دو قبیلوں اور جماعتوں کے باہمی نزاعات، قرض اور

[1] عبدالرحمن عمیرہ، ص ۸۴۔

لین دین کے معاملات، سرحدی علاقوں کے دفاع کے لیے فوجوں کی تیاری اور دیگر معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی امور زیر بحث آتے تھے۔ مساجد سے ملحق کتب خانوں کا کردار مذہبی خدمات کے علاوہ علمی اور سماجی زندگی میں بھی بہت اہم رہا ہے۔

اسلامی تہذیب کے ارتقاء کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے مکاتب، مدارس اور مساجد کی خدمت میں بھی انکا بہت اہم کردار ہے۔ بڑے اور اہم مدارس کے موسسین نے مدارس سے ملحق لائبریریوں کے قیام میں بڑی دلچسپی ظاہر کی اور ان میں اسلامی علوم کے مختلف موضوعات پر کتابوں کو جمع کرنے کی مکمل کوشش کی۔ ان کتب خانوں نے مسلمانوں کے لیے علمی تعلیم و تربیت کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔

عہد اسلامی میں کتب خانہ علم و تحقیق اور کتابوں کی نشر و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس میں مساجد سے الحاق کے باوجود علوم کی مختلف شاخوں سے متعلق کتابیں ہوتی تھیں تاکہ علم و تحقیق کے تقاضے کما حقہ پورے ہوسکیں۔ بعض کتب خانے اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے اور بعض مخصوص موضوعات پر تحقیق کے لیے مختص تھے۔

ان کتب خانوں کو سماجی کلب کی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں شہر کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرکے تفریح اور لطف حاصل کرتے۔ اس طرح کا سب سے عمدہ کتب خانہ "بصرہ لائبریری" تھی جس کا ذکر حریری نے چھٹی صدی ہجری میں اپنی کتاب "مقامات" میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"یہ لائبریری اہل علم کی اسمبلی تھی اور سیاحوں اور دیگر لوگوں کے لیے اسے مقام ملاقات کی حیثیت حاصل تھی"۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے انداز کا یہی صرف ایک کتب خانہ نہیں تھا بلکہ اسلامی دنیا میں اس طرح کے بہت سے کتب خانے موجود تھے۔

غرض علمی و سماجی حیثیت کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی کتب خانوں کا اچھا کردار رہا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلفاء اور شہزادے اور مذہبی علماء اور معلمین کیوں کتب خانوں کے قیام اور ان کی دیکھ بھال میں اس قدر غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں ترقی یافتہ اسلامی تہذیب و تمدن کی ایک علامت تصور کرتے تھے۔ اس لیے حملہ آوروں نے سب سے پہلے اسلامی کتب خانوں کو ہی اپنا نشانہ بنایا اور انہیں تباہ و برباد کیا، کیونکہ وہ مسلمانوں کی فکر اور ان کی تہذیب کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلاکو خان نے ۶۵۶ھ کے اپنے حملہ میں بغداد کے "بیت الحکمۃ" اور عباسی سلطنت کے "القضا" کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

اب یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ہر قسم کے کتب خانوں کی خواہ وہ ذاتی نوعیت کے ہوں یا پبلک، حفاظت کریں کیونکہ یہ عام معلومات اور بالخصوص اسلامی علوم و فنون کا سرچشمہ ہیں ہمیں قیمتی اور نادر کتابوں اور مخطوطات کو حاصل کرنا چاہیے۔ جدید دور میں ہر ملک کے پاس اپنے کتب خانے ہیں اور ہر ملک اپنے علمی ورثہ کی حفاظت اور ان کی ترقی پر فخر کرتا ہے۔ مسلم ممالک اور مسلم اقوام بھی اگر سوچیں تو لائبریریاں ان کے لیے اعزاز و افتخار کا درجہ رکھتی ہیں۔

معارف: (فرانسیسی رسالہ DER ISLAM میں طبع ہوئے ایک انگریزی مضمون کا یہ اردو ترجمہ ہے)

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا عربی کلام

از جناب ابو صہیب رومی مچھلی شہری

(۲)

(۷) مخطوطہ کے ساتویں خمسے میں بند کے شعر کا دوسرا مصرع یہ ہے:

ع اَنْتَ یاصِدیق عاصی تب الی المولیٰ الجلیل زیر بحث مناجات کے اسی مصرع نے اس مناجات کو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کرنے کی بات کو تقویت دے دی ہے، اس نسبت کی صحت و حقیقت سے بحث تو شاید آگے ہو سکے یہاں تو سردست اعراب و کتابت سے متعلق فروگذاشتوں ہی تک بات کو محدود رکھنا ہے۔

اس مصرع میں اعرابی غلطی یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں یاصدیق کے تخلص کے بعد (یہ لطیفہ ملحوظ رہے کہ عربی شاعری میں تخلص کا رواج مطلق نہ تھا شاید ہی تلاش بسیار کے بعد کسی شعر میں شاعر کا تخلص برآمد کیا جا سکے گا، مگر حضرت صدیق ایسے شاعر ہیں کہ تخلص موجود ہے) عاصی کا لفظ آیا ہے جو اسم منقوص ہے اور غیر معرف باللام ہی ہے جس کا اعراب حذف یاء کے بعد تنوین کی صورت میں ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ عاصی (بالیاء) کی جائے بغیر یاء کے تنوین کے ساتھ عاصٍ لکھنا چاہیے تھا، اس کی وجہ سے مصرع کا وزن بھی متاثر نہیں ہو رہا تھا

پھر بھی قاعدہ کی خلاف ورزی کی گئی یہ غلطی کس کی ہے؟ کاتب کی یا شاعر کی؟ اسکا فیصلہ راقم السطور نہیں کرنا چاہتا اس لیے اسے اس راہ کے محققین کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

مخطوطہ کے مطابق مندرجہ بالا شعر جس میں شاعر کا تخلص بھی ہے۔ ساتویں مخمس میں دیا گیا ہے، جس کے بعد مناجات کے بقیہ چار مخمس لکھے گئے ہیں۔ حضرت شاہ نیاز احمد نیاز علیہ الرحمہ نے بھی اسی ساتویں ہی مخمس میں خود اپنا تخلص آسی استعمال فرمایا ہے حالانکہ تخلص آخری شعر میں اور بصورت تخمیس آخری بند میں استعمال ہوتا ہے اس لیے تخلص والے آخری شعر اور خمسہ جات کے آخری مخمس کو گیارہویں نمبر سے ساتویں نمبر پر کیسے پہنچا دیا گیا۔ کاتب مخطوطہ کیا شعر و شاعری سے متعلق اس درجہ کی "جنرل نالج" نہیں رکھتے تھے کہ تخلص مقطع میں ہوتا ہے اور مقطع آخر میں ہوتا ہے۔

حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمہ کی تخمیس شعری قاعدہ کے مطابق ہے اس میں یہ شعر مناجات کا گیارہواں شعر ہے اور اس کا خمسہ گیارہواں خمسہ ہے، اسی خمسہ میں حاجی صاحب کا تخلص "غریب" موجود ہے۔ پورا خمسہ لاحظہ فرمالیا جائے۔

ہوش میں آ اے غریب سرخوش جام صبوح — کر عمل اچھے برے ہوتے ہیں افعال قبوح
کیا بھروسا زندگی کا ہے مسافر تن میں روح — این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوح
انت یا صدیق عاصی تب الی المولیٰ الجلیل

(نالہ امداد غریب مشمولہ رسالہ جہاد اکبر ناشر راشد کمپنی دیو بند ص ۱۹ تا ۲۱)

(۸) نویں مخمس کے آخری تین مصرعے یوں تحریر کیے گئے ہیں:

ضاع عمرہ فی ہوی نفس و فی طول الامل — کیف حالی یا الٰھی لیس لی خیر العمل
سوءُ اعمالی کثیرا زاد طاعاتی قلیل

پہلی غلطی جو مخمس کے تیسرے مصرع میں ہے یہ کوئی نئی غلطی نہیں ہے بلکہ یہ اسی روشن و تابناک غلطی کا اعادہ ہے جسے ہم دوسرے مخمس کے پہلے مصرع کے تحت اوپر لکھ آئے ہیں، یہاں بھی ناقل و کاتب میں سے کسی ایک نے یا دونوں نے اجتماعی طور پر ضائع کے عین کو ادھورا لکھ کر ء (ہمزہ) کی شکل دے دی ہے۔ جس کی وجہ سے ضائع کی صرف عین ہی غائب نہیں ہوئی بلکہ پورا شعر ہی فاقد العین (کور چشم اور اندھا) ہو کر رہ گیا ہے، حضرت شاعر کی طرف ایک ایسی بات منسوب ہو گئی ہے جس سے وہ ہزار بار پناہ چاہیں گے۔

دوسری غلطی چوتھے مصرع میں آئے ہوئے لفظ خیر العمل کا اعراب ہے جو مخطوطہ میں خیر کی راء کے فتحہ کے ساتھ مفتوح دکھلایا گیا ہے حالانکہ خیر العمل لیس (فعل ناقص) کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہی لکھا جانا چاہیے تھا۔

تیسری اور چوتھی غلطی پانچویں مصرع کے دو الفاظ (سوءُ الاعمالی کثیر اور زاد طاعاتی) کے اعراب سے متعلق ہے۔ کثیر کا لفظ سوء اعمالی کی خبر ہے جو مرفوع ہونی تھی اسی طرح زادُ طاعاتی میں زاد کا لفظ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوتا تھا مگر کاتب کی بے خبری دیکھئے ع اسے نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم، دونوں ہی جگہ زبردستی زبر لگا دیا ہے۔

(۹) دسویں بند کے دونوں ہی مصرعوں میں غلطیاں ہیں اور شہرت کے مطابق یہ دونوں مصرعے گویا حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمودہ ہیں اس وجہ سے ان میں غلطی کیسی سنگین بن جاتی ہے۔ پورا شعر مخطوطہ میں یوں لکھا گیا ہے ؎

وَاشْفِ عَنّی کُلَّ دَاءٍ وَاقْضِ عَنّی حاجتی   اِنَّ لی قَلْبٌ سَلِیْمٌ اَنْتَ مَنْ یَشْفِ العلیل

دونوں مصرعوں کے خط کشیدہ فقرے محل غور ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اشف عنی کل داءٍ کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ اے اللہ میری طرف سے تو ہر بیماری کو شفا دے دے یعنی مریض کو شفا دینے کی بجائے خود بیماری کے لیے شفا چاہی جا رہی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی اناڑی معالج کی مضحکہ خیزی کے وقت کہدیتے ہیں کہ ایسی دوا دیدی کہ نہ مرض رہا نہ مریض، بات کی سیدھی سی تعبیر یہی تھی کہ یوں کہا جاتا "اشفنی من کل داءٍ" (مجھکو ہر بیماری سے شفا دے دیجئے) اس سیدھی سی تعبیر کو چھوڑ کر اشف عنی کل داءٍ کہنے میں کیا نکتہ ہے؟ اسے دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔

ویسے حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمہ کی تضمین والی نظم میں یہ مصرع یوں ہے اور بالکل صاف ہے ع عافنی من کل داءٍ واقض عنی حاجتی"، اس شعر میں دوسری غلطی دوسرے مصرع میں ہے جو قلبٌ سَلیمٌ" کا غلط اعراب ہے قلبٌ سلیمٌ اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے منصوب ہونا تھا مگر بے خبری میں اسے پیش دیدیا گیا ہے۔

(۱۰) مناجات کے آخری مخمس نمبر ۱۰ میں دوسرا مصرع یوں ہے:

ع مِنْکَ عَفْوًا اَرْتجی یا رَبِّ فاجعلنا معاف"

اس مصرع کا آخری لفظ معاف (جو خط کشیدہ ہے) قابل غور اور لائق توجہ ہے، غور یہ کرنا ہے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے یہ لفظ معاف عفو کے ساتھ اسی سیاق میں اور اسی (عفو و درگذر کے) مفہوم میں استعمال فرمایا ہے اور یہ درست ہے کہ معاف اردو و فارسی زبان میں اس مفہوم میں بولا بھی جاتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ معاف اپنی اسی شکل و صورت کے ساتھ عربی لفظ نہیں ہے کیونکہ

"عفو" کے مادہ سے جب باب مفاعلۃ میں بولیں گے تو مصدر معافاۃ ہوگا جس کا اسم فاعل مُعافی (عافیت دینے والا یا عفو فرمانے والا) ہوگا اور اسم مفعول مُعافیٰ ہوگا معاف بحذف مقصورہ نہیں ہوگا۔ معافیٰ میں حذف یا کا تصرف فارسی والوں نے کیا ہے ایران و فارس کے توسط سے یہ لفظ اردو میں بھی آگیا ہے لیکن عربی زبان میں اس کا استعمال خلاف عربیت اور غماز عجمیت ہے۔ صاحب غیاث لکھتے ہیں:

"معاف بضم میم در اصل معافی بود بر وزن مُنادی اسم مفعول از باب مفاعلۃ که مصدرش معافاۃ بر وزن مناجاۃ ماخوذ از عفو پس در استعمال فارسیان الف از آخر معافی که مقلوب از یائے ساقط شده چنانکه در لفظ صاف که در اصل صافی بود صیغہ اسم فاعل در استعمال فارسیان یا از آخر آں افتاد یا چنانکه لفظ متعال که در اصل متعالی بود یا از آخر آن در حالت وقف ساقط شده پس معاف بفتح میم چنانکه شهرت دارد غلط است" (غیاث اللغات)

صاحب غیاث اللغات نے پوری بات صاف کر دی ہے کہ معاف سے یا (الف مقصورہ) کا حذف اہل فارس کا تصرف ہے اور یہ کہ فارسی یا اردو میں بھی یہ لفظ ضم میم کے ساتھ بولا جانا چاہیے۔ میم کے فتحہ کے ساتھ اردو و فارسی میں بھی درست نہیں ہے۔

مخطوطہ میں شامل تین قسم کے مجموعی ۴۶ خمسہ جات کے کلمات کے اعراب و کتابت کی غلطیوں کا **مفصل جائزہ** لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام عربی کی عربیت و ادبیت سے متعلق مسامحات کا بھی بقدر ضرورت ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ اس سلسلہ میں آیندہ کام کرنے والوں کے لیے اپنے

تحقیقی مقالہ کی تیاری کے لیے مختلف و متعدد موضوعات بحث و تحقیق دستیاب رہیں اور بانی سلسلہ نیازیہ حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی علیہ الرحمہ کے عربی کلام پر تحقیقی کام ان کی شہرت و مرتبت کے شایان شان طور پر انجام پا سکے۔

دستیاب شدہ کلام عربی کے مخطوطہ کے مطابق خمسہ جات کا پہلا مجموعہ جو ۳۲ بندوں پر مشتمل ہے اس خمسہ اول کا چوتھا مخمس ملاحظہ ہو، پورا مخمس نقل کرنا موجب طوالت ہے، اس کا تیسرا مصرع قابل غور ہے، مصرع یہ ہے:

ع "اَتِنِی یاسیدی منی النجاۃ" (یہاں اس بات پر انتباہ چنداں ضروری نہیں ہے کہ ضرورت شعری اور ضرورت قافیہ کی وجہ سے النجاۃ کی تائے مدورہ کو مستطیلہ لکھا گیا ہے)

مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ اس مصرع کا مفہوم کچھ مبہم اور غیر واضح ہے جناب مترجم کے ترجمہ سے بھی کوئی مفہوم ہاتھ نہ آسکا، ان کا ترجمہ یہ ہے "عطا کرو اے میرے سردار[1] میری ہستی سے رہائی"۔

اس ترجمہ میں ہستی کا مفہوم فاضل مترجم نے کس لفظ سے اخذ کیا ہے؟ پتہ نہیں چلتا حالانکہ موصوف بالعموم تحت اللفظ ہی ترجمہ کے عادی ہیں مگر یہاں انہیں اپنے ترجمہ میں ہستی کا لفظ و مفہوم بڑھانا ہی پڑ گیا، ان کے اسی اضافہ نے فہم شعر کا راستہ کچھ آسان کر دیا مگر مصرع کا مفہوم کما حقہ واضح نہ ہو سکا، اگر وہ مصرع کا ترجمہ یوں فرما دیتے تو بات شاید زیادہ واضح ہو جاتی کہ "اے میرے سردار مجھ کو ہستی سے رہائی عطا فرما دیجیے"۔

---

[1] معارف: نقل مطابق اصل نہیں ہے۔ اصل ترجمہ میں "سردار میرے" ہے۔

مصرع کے الفاظ و ترکیب پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ جو کچھ فرمانا چاہتے ہیں وہ اس چھوٹی سی بحر کے ایک مصرع میں واضح طور پر ادا نہیں ہو سکا ہے یا تو مناسب الفاظ ذہن میں مستحضر نہ تھے یا جو مستحضر تھے وہ اداے مطلب کے لیے ناکافی رہے۔ مجموعی طور پر مصرع کے الفاظ کی بندش و ترکیب چست نہیں ہو سکی۔

(۲) اسی "خمسۂ اول" کے پانچویں مخمس میں دوسرے مصرع پر نگاہ توجہ ذرا ٹھٹکتی ہے۔ اس مصرع میں ایک فقرہ یہ ہے "من هُمومات البلایا"، صرفی قواعد کے تحت یہ دونوں ہی جمع الجمع کے صیغے ہیں[1] کسی بڑے سے بڑے صرفی بلکہ صراف کی یہ مجال نہ ہوگی کہ وہ اسے غلط کہہ سکے لیکن ادب کے ذوق لطیف پر یہ ترکیب ان دونوں جمع الجموع کا مجمع گراں ضرور محسوس ہوگا، جمع الجمع کا استعمال حد جواز میں ضرور ہے لیکن اہل علم کی فصیح عبارات میں مشکل ہی سے دستیاب ہوگا۔

(۳) چھٹے مخمس کے پہلے ہی مصرع میں قافیہ کا لفظ "انتضاج" (پختگی) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب تک یہ لفظ مجرد سے اور باب افعال سے مستعمل ہوتے سنا تھا، منضج تو اطباء کے یہاں کثرت سے بولا اور لکھا جاتا ہے، لیکن یہ انتضاج بالکل غیر مانوس اور نیا سا لگا، المنجد دیکھی اس میں نہیں مل سکا ہے، تحقیقی کام کرنے والوں کو اس نئے عربی لغت میں غیر موجود لفظ کی سند اور حوالہ کی بھی تلاش کرنا ہوگی، ممکن ہے لغت کی بڑی کتابوں میں کوئی سند مل جائے۔

---

[1] معارف: مگر بلایا تو بلیہ کی جمع ہے۔

(۴) دسویں مخمس کے پہلے اور دوسرے مصرعوں میں هُمومات البلایا کے ساتھ ساتھ غُمومات الحنظا کے فقروں پر بھی نگاہ توجہ ٹھٹکی۔ دونوں ہی فقرے دائرہ جواز میں رہتے ہوئے بھی ہندی عجمیت کی غمازی تو کرہی رہے ہیں۔ اس مخمس کا تیسرا مصرع یہ ہے جو قابل توجہ ہے ع "ما لشیئٍ مثلکم حکم النفاذ"

بظاہر یہاں بھی وہی صورت ہے کہ اداے خیال کے لیے مناسب الفاظ اور مستقیم تعبیر پر دسترس نہ ہو سکی اور خیال و الفاظ کی چولیں باہم نہ مل سکیں۔

مترجم صاحب نے بالکل ٹکسالی انداز کا تحت اللفظ ترجمہ یوں فرمایا ہے:

"نہیں ہے[1] کسی چیز کو مثل تمہارے حکم کے جاری ہونا"

اس ترجمہ کو دیکھتے ہی صاف پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا نظم فرمودہ خیال مترجم صاحب کی گرفت میں نہیں آرہا ہے اور ٹھیٹھ قسم کا لفظی ترجمہ فرما کر عہدہ برآ ہو جانا چاہتے ہیں۔

راقم السطور کے فہم ناقص میں مصرع کا یہ مطلب بہ تکلف نکالا جا سکتا ہے شاہ صاحب فرمانا چاہتے ہیں کہ

اے ممدوح! کسی چیز کو حکم نفاذ دینے والا تم جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے یعنی ہر چیز صرف تمہارے ہی حکم سے نافذ ہوتی ہے۔ مگر یہ مطلب نکالنا پڑتا ہے خود بخود نہیں نکلتا، پھر اس مطلب پر جو اعتقادی ضرب پڑتی ہے وہ یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ اس قسم کی مدح خود اس ممدوح کو پسند آئے گی یا نہیں؟ وَ إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ الخ کی تفسیر ان سے

---

[1] معارف: "ہے" مضمون نگار کا اضافہ ہے۔

زیادہ کیسے معلوم ہوگی؟

اسی لیے یہ بات عرض کی گئی کہ اس مصرع کا مفہوم غیر واضح ہے کوئی ایسا مفہوم جو حضرات مادح وممدوح کے مطابق حال بھی ہو اور مصرع کے الفاظ سے بآسانی خود ہی سمجھ میں آسکے، ہمیں متعین کرنا ہوگا۔

(۵) بارہویں بند کے پہلے اور دوسرے مصرع کے قافیے فایز اور جایز استعمال کیے گئے ہیں ان دونوں ہی قافیوں میں حرف قافیہ زا رسے پہلا حرف ہمزہ یا یاء ہے، لگاتار دو مصرعوں میں یا کا التزام کر لینے کے بعد تیسرے مصرع عاجز کا قافیہ تنگی قافیہ اور عجز شاعر کی غمازی کر رہا ہے، بہتر صورت یہی تھی کہ اوپر کے دو مصرعوں میں لگاتار یہ التزام نہ کیا گیا ہوتا۔

راقم السطور فن شاعری کی نزاکتوں اور باریکیوں سے زیادہ واقف نہیں ہے، یہ موشگافیاں صرف اس لیے کی جارہی ہیں کہ تحقیقی کام کرنے والے حضرات جب کام کریں تو بحث کی ان باتوں کو بھی صاف کر کے حق تحقیق ادا کریں۔

(۶) پندرہویں خمسے میں دو ایک چھوٹی چھوٹی فروگزاشتیں ہیں جن کا ذکر مضمون کی قسط اول ہی میں آنا چاہیے تھا۔

پہلے مصرع میں "بالاختصاص" تو صحیح لکھا گیا ہے لیکن ترجمہ میں بالخصوص کو بالخصوص لکھ دیا ہے "الف لام" والا الف جب بار کے ساتھ شامل کر دیا گیا تو پھر علیحدہ لکھنا تکرار ہے اور غلط ہے۔ اسی طرح غُصّتُ کے لفظ میں (جو دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ہے) غین کو ضمہ ہونا چاہیے لیکن کاتب کی زبردستی یہاں بھی ہوگئی اور

غین کو زبر دے دیا ہے۔

(۷) سترہویں مخمس میں پہلے مصرع کا قافیہ "انضباط" ہے جو اردو میں ضرور مستعمل ہے لیکن عربی کی متداول کتب میں یہ مادہ باب انفعال سے مستعمل نہ مل سکا ہے ممکن ہے کہ زیادہ تلاش وتفحص سے کام لیا جائے تو شاید کسی لغت میں سند مل جائے۔ ویسے اردو زبان میں اس طرح کے بعض دوسرے الفاظ بھی ہیں جو عربی سمجھ کر بولے اور لکھے جاتے ہیں لیکن عربی کی کتب لغت نے انہیں عربیت کی سند نہیں دی ہے، اس سلسلہ میں خود اپنا ہی ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں:

راقم کی تعلیم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں ہوئی ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، وہاں حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوری علیہ الرحمہ (جو حضرت مفتی سعد اللہ صاحب رامپوری کے پوتے تھے) احقر کے نہایت شفیق استاد و مربی تھے، ادب و زبان کے مضامین سے تھوڑا بہت جو کچھ بھی لگاؤ ہوا ہے موصوف ہی کی تربیت و تمرین کا رہین منت ہے، استاذ محترم سے ایک بار کہیں سن لیا کہ لفظ تنقید عربی لغت کا لفظ نہیں ہے، اردو والوں نے عربی وزن پر بنا لیا ہے، (بعد کو جب "نگار" کے "انتقادیات" سے واقفیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ بات یہی ہے)

راقم جس وقت نفحۃ الیمن پڑھتا تھا اس پر ایک مشہور عالم وادیب کا حاشیہ تھا، موصوف نے اپنے حاشیہ سے متعلق ایک بڑے عالم و بزرگ سے تقریظ لکھوائی تھی اور تقریظ سے پہلے اپنی طرف سے جو عربی عبارت لکھی تھی اس میں تقریظ کے ساتھ ساتھ تنقید کا لفظ بھی تحریر فرما دیا تھا، ایک موقع پر

ان صاحب تحشیہ عالم سے ملاقات ہوگئی، اب یہ طالب علمانہ شوخی ہی تھی کہ بے تکلف ان سے دریافت کر ہی لیا کہ لفظ تنقید عربی زبان میں مستعمل ہے یا نہیں؟ اس استفسار کا جواب انھیں پوری علمی ذمہ داری سے دینا تھا، فرمایا کہ نہیں یہ لفظ عربی زبان میں مستعمل نہیں ہے، اب میں نے دوسرا استفسار کر دیا کہ آپ نے نفحۃ الیمن کے اپنے حاشیہ سے متعلق فلاں بزرگ کی جو تقریظ شایع کی ہے وہاں آپ نے تقریظ کے ساتھ ہی ساتھ تنقید کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے، موصوف علیہ الرحمہ نے اپنی عالی ظرفی اور علمی دیانت کو ملحوظ رکھا اور جواب میں کسی حجت، دلیل اور توجیہ و تاویل کا طریقہ نہیں اپنایا حالانکہ ملاؤں کو بدنام کرنے والوں نے یہ ضرب المثل بھی مشہور کر دی ہے کہ:

"ملا آں باشد کہ چپ نشود"

بات صرف اتنی تھی کہ رواج عام کے تحت بالکل بے خیالی میں تنقید کا لفظ وہ لکھ گئے تھے، میرے استفسار نے انھیں چونکا دیا اور پھر انھوں نے وہی صحیح جواب دیا جو اہل حق صاحب علم کی شایان شان تھا۔

بہت ممکن ہے کہ یہی صورت یہاں لفظ "انضباط" کے معاملہ میں بھی ہوگئی ہو، اسی بنا پر راقم السطور نے ابتداءً ہی اپنے زیر نظر مضمون میں اشارۃً یہ بات لکھ دی تھی کہ اس قسم کی فروگذاشتیں اہل عجم بالخصوص اہل ہند کے عربی کلام میں ہو ہی جاتی ہیں۔

(۸) اسی سترہویں مخمس کا تیسرا مصرع یہ ہے "اِنَّکَ تَهدِیْ لِلوریٰ خَیْرَ الصراط" یہاں تہدی کا لفظ ہدایت کا فعل مضارع ہے، عربی لغت و استعمال کے مطابق اگر ہدایت کے دو مفعول لائے جائیں گے تو پہلا مفعول بغیر حرف جر استعمال ہوگا، البتہ دوسرے مفعول پر لام یا الیٰ کوئی سا ایک حرف جر استعمال ہوتا ہے، مصرع مذکور میں بھی دو مفعول لائے گئے ہیں پہلا مفعول الوریٰ (مخلوق) اور دوسرا مفعول خیر الصراط ہے، قاعدہ کے مطابق الوریٰ پر حرف جر نہ آئے گا ہاں خیر الصراط پر لام یا الیٰ آ سکتا ہے، اس لیے کہا جا رہا ہے کہ درست یہ صورت بھی ہے کہ ہر دو مفعول بغیر حرف جر مستعمل ہوں جیسے قرآن مجید میں سورۂ دہر میں ہے اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ یہاں دونوں ہی مفعول بغیر حرف جر استعمال ہوئے ہیں۔

اس قاعدہ کے مطابق للوریٰ پر لام حرف جر خلاف لغت استعمال ہے، خیر الصراط پر لام ہوتا اور الوریٰ پر نہ ہوتا تو بات ٹھیک ہوتی۔ اب دوسری نقول میں بلکہ خود حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تحریر تلاش کر کے اس کو دیکھنا چاہیے کہ وہاں یہ مصرع کس طرح ہے؟

(۹) انیسویں مخمس میں تیسرا مصرع یوں ہے ع "سرعتہ انظر بطرفی یا سریع"، اس میں خط کشیدہ فقرہ انظر بطرفی مختلف جہتوں سے محل غور ہے۔

(الف) لفظ طَرَف بفتحتین ہے جبکہ مصرع میں بسکون را لکھا گیا ہے اور مصرع میں موزوں بھی سکون را ہی کے ساتھ ہوگا۔

(ب) عربی لغت میں یہ لفظ سمت و جہت کے اس مفہوم میں مستعمل نہیں ہے جس مفہوم میں اردو زبان والے استعمال کرتے ہیں "المنجد" عربی زبان کی متداول لغت ہے، اس میں طرف کے مندرجہ ذیل معانی درج ہیں:

"ہر چیز کی حد، گوشہ، کسی چیز کا ٹکڑا، شریف آدمی"۔ المنجد کے معانی میں

سمت و جہت کے معنی موجود نہیں ہیں، اس معنی میں اس کا استعمال "خلاف عربیت"
نظر آتا ہے، اچھا ہوگا کہ اس بات کی پوری تحقیق کرلی جائے۔

(ج) لفظ بطی فی پر جو حرف با ہے بظاہر یہ "نظی" کے صلہ میں آئی ہے
جبکہ نظی کا لفظ اور اس کے مشتقات یا تو بغیر کسی صلہ کے متعدی ہوتے ہیں یا پھر
اس کے صلہ میں حرف الیٰ آتا ہے، حرف با کا صلہ ہونا لغت سے دریافت نہیں ہو

(۱۰) بیسویں مخمس کا دوسرا مصرع یوں ہے ع مَنْ اَحَبَّکَ مِنْ ھموم فارغ،

حضرت شاہ صاحب کا یہ مصرع ہے یا ان کی طرف غلط طور پر یہ عربی کلام بھی
منسوب ہوگیا ہے؟ (یہ بحث بھی قابل غور ہے) واقعہ چاہے جو کچھ بھی ہو مخمس کا
یہ مصرع اختصار و ایجاز کا عجیب و نادر نمونہ ہے کہ "مَنْ اَحَبَّکَ" کے صرف دو
لفظوں پر مشتمل پورا جملہ شرطیہ ہے اور بظاہر دوسرا جملہ اس کی جزا ہے جسے سز
یہ دی گئی ہے کہ صرف جار و مجرور ہی سے پوری جزا کا کام لے لیا گیا ہے۔ عربی قوا
نحو کے مطابق اسی جار و مجرور کا متعلق محذوف ہے جو بہ تقاضائے مفہوم شعر
یہاں پر "صاد" ہو سکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب جیسا عالم و مدرس قادر الکلام شاعر، عربی شاعری میں
یوں عاجز و غیر قادر ہو جائے گا یہ بات قرین عقل و فہم نہیں کہی جا سکتی، اگر یہ کلام
حضرت شاہ صاحب ہی کا ہے تو یہ صورت اسی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی ہے جس کی
طرف اشارہ اوپر کی معروضات میں دوبار کیا جا چکا ہے کہ بحر بہت ہی چھوٹی ہے
بڑی بات ادا کرنا دشوار ہوتا ہے ویسے تعبیر کی ایک دوسری صورت بھی ہو سکتی
تھی مگر حذف سے مفر اس میں بھی نہ تھا وہ یہ کہ یہ مصرع یوں کہا جاتا:

"من احبک صار قلبہ فارغ"

(۱۱) اکیسویں مخمس کا پہلا مصرع بھی قابل ملاحظہ و لائق توجہ ہے ع یا علی
احسن علی امی غریب اس میں دو باتیں قابل غور و توجہ ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ عربی زبان و لغت کے مطابق احسان اور اس کے مشتقات
کا صلہ الیٰ یا با آتا ہے، علیٰ نہیں آتا، اردو زبان بولنے والے اپنی زبان و روزمرہ
کے مطابق اردو میں یوں ہی بولتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا احسان ہے یا
مجھ پر آپ کا احسان ہے اور پھر اسی پر کی عربی کے طور پر عربی میں علیٰ کا استعمال
کر گذرتے ہیں جو یقیناً خلاف لغت و خلاف عربیت ہے۔

ایسی ہی باتوں کی وجہ سے اوپر اشارۃً عرض کر دیا گیا ہے کہ اہل عجم کے ہاں
ایسی فروگذاشتیں ہو جایا کرتی ہیں چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عربی نصاب کی
زیر درس عربی کتابوں میں بھی جو اہل ہند کی تصنیف کردہ مدارس میں پڑھائی جاتی
ہیں ان تک میں ایسی فروگذاشتیں موجود ہیں۔

اس مصرع میں دوسری قابل توجہ بات لفظ "غریب" بیچارہ ہے، عربی قاعدہ
کے مطابق یہ لفظ امی کی صفت ہے اور امی حضرت شاہ صاحب کا تخلص گرامی ہونے
کی وجہ سے شان تعریف رکھتا ہے، اس کی شان کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی صفت
بھی شان تعریف سے متصف ہو لیکن مصرع میں بیچارے "غریب" کو نکرہ ہی
رکھا گیا ہے۔ غریب کے ساتھ یہ سوتیلا پن غالب یہی ہے کہ کاتب نے کیا ہوگا
اور ممکن یہ بھی ہے کہ اردو زبان کے روزمرہ کے مطابق امی کے ساتھ "غریب"
یوں ہی بے خیالی میں بے قاعدہ استعمال ہو گیا ہو۔ اور چونکہ اس مخمس کے ابتدائی

تین مصرعوں میں امی غی بیب کا فقرۂ تخلص مکرر ہوا ہے لہذا یہ فروگزاشت بھی مکرر
سہ کرر ہو گئی ہے جو بہر حال خلاف قاعدہ عربیت ہے۔

ان معروضات کو پیش کرتے وقت ان فروگذاشتوں کے اعداد و شمار کی زیادتی
دکھلانا ہرگز پیش نظر نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ حضرت اقدس شاہ نیاز احمد نیاز
بریلوی کی بلند و بالا شخصیت کے شایان شان ان کا عربی کلام (بشرطیکہ یہ کلام
فی الواقع انہیں کا ہو) ہر طرح سے منقح مکمل و مدلل ہوکر سامنے آئے۔ اسے زیور
طبع سے آراستہ کرنے والے اس سے متعلق پوری طرح واقف و باخبر ہوں۔

آیندہ سطور میں اسی "مجموعہ قصائد" کے خمسۂ دیگر سے متعلق کچھ معروضات
پیش کی جارہی ہیں جو ۲۱ بند پر مشتمل اور خانوادۂ رسالت کے چار افراد اور خود
ذات بابرکات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و منقبت پر مشتمل ہے،
ان خمسہ جات کے متعدد اشعار میں خمسہ کا عدد بار بار مکرر آیا ہے جسے پڑھکر
قاری کا ذہن خود بخود اس بات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ خمسہ جات کے
کے مشہور شعر لی خمسۃ اطفی بھا الخ کے متوازی اور اس کی تشریح کے طور پر
کہے گئے ہیں۔ "ناد علی" کی طرح "لی خمسۃ اطفی بھا" والا مشہور شعر بھی عقیدۂ
توحید سے متصادم ہونے کی وجہ سے اہل سنت میں رائج نہ ہونا چاہیے تھا
مگر جو لوگ پروپیگنڈہ میں اس حد تک آگے جا سکتے ہیں کہ "ناد علی" کو مزاروں
کے مناروں پر کندہ کرا دیں انہوں نے اس توحید شکن قطعہ کو بھی ہر ذریعہ سے
مشہور کر ہی دیا ہے حالانکہ اس شعر میں بھی متعدد لسانی و ادبی غلطیاں موجود ہیں
مگر یہ بحث ایک علیحدہ مضمون چاہتی ہے، یہاں تو حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی

علیہ الرحمہ کے عربی کلام پر مشتمل خمسہ جات موضوع گفتگو ہیں خمسہ دیگر کے تحت مخطوطہ
میں شایع شدہ دوسرا مخمس ملاحظہ ہو :-

اِصطفی اللّٰہُ فِی وَرَاءِ الکل — خمستہ طورھم وراء الکل
قد رھم لا علی سواء الکل — ھم نجوم علی سماء الکل
ضوءھم قد اضاء طبقاتین

اس مخمس میں پہلی بات دوسرے مصرع کے لفظ خمستہ سے متعلق ہے،
مخطوطہ میں خَمْسَتُہٗ کی تا مرفوع (دو پیش کے ساتھ) لکھی ہوئی ہے، اس صورت
میں عبارت میں ایک مبتدا محذوف ماننا پڑے گا اور یہ خمستہ زبردستی اس کی
خبر بنائی جائے گی یہ صورت سراسر تکلف بے جا پر مبنی ہے، بے تکلف سیدھی
سادی بات یہ ہے کہ اس رفع کو کاتب کی غلطی مان کر خمستہ کا اعراب نصبی حالت
میں رکھا جائے اور اسے اصطفی (فعل) کا مفعول بہ سمجھا جائے، یہی صورت صحیح
معلوم ہوتی ہے چنانچہ آگے نویں مخمس میں حضرت شاہ نیاز صاحب موصوف نے
خود بھی یہی صورت اختیار کی ہے جہاں فرمایا ہے" اجتبیٰ اللّٰہ خَمْسَتَہٗ"

اس مخمس سے متعلق دوسری گزارش یہ ہے کہ مخمس کے پہلے دو مصرعوں میں
تو وراء ہی کا قافیہ مکرر ہو گیا ہے یہ تکرار فنی طور پر عیب بھی شمار ہوتا ہے اور
اس سے شاعر کی قدرت علی الکلام بھی مجروح ہوتی ہے، پھر ایک دوسری بات
اور بھی ہے کہ پہلے مصرع میں وراء سے پہلے "فی" کے اضافہ سے بھی مصرع میں
ایک فی نکل آئی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مخمس کے بند والے مصرع میں "طبقاتین" کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے، یہ بات صاف نہیں معلوم ہوتی کہ یہ لفظ ہے کیا اسے طبقتین صیغۂ تثنیہ سمجھا جائے اور الف کو الف اشباع تصور کیا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ یہ طبقہ کی جمع طبقات کا تثنیہ ہے ؛ یہ بات کچھ عجیب سے ہوگی اس لیے اہل تحقیق مختلف لغول سے مراجعت فرماکر متعین فرمائیں کہ یہ کیا لفظ ہے ؟

(۳) اب اس سلسلہ کا تیسرا بند ملاحظہ ہو :۔

خمسۃ کلھم نجوم ھدیٰ ان خیر الانام شمس دحی

وعلیٌ اخوہ بدر دجیٰ زھرۃ الشکل بنتہ الزھریٰ

صورۃ المشتری حسن وحسین

اس مخمس کے دوسرے مصرع میں خیر الانام حضور عالی مقام صلوٰۃ اللہ علیہ السلام کی ذات بابرکات کے لیے شمس دحیٰ کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے جو "اغلاط کتابت" کی تاریخ میں عجیب وغریب نہایت ہی نادر قسم کی غلطی ہے (اسی ندرت کی وجہ سے نظر کی گرفت میں پہلی بار نہ آسکی ورنہ اس کا تذکرہ اغلاط کتابت ہی کے تحت ہونا چاہیے تھا)

"ضاد" عربی کے حروف تہجی کا ایک مشہور ومخصوص عربی حرف ہے یہ حرف صرف عربی الفاظ ہی میں ملتا ہے دوسری زبان میں مستعمل نہیں ہے۔ حرف ضاد کے تلفظ کا جھگڑا تو اکثر سننے میں آتا رہتا ہے کہ یہ حرف کس طرح ادا کیا جائے ضالین کو دالین (دال کی آواز میں) پڑھیں یا ظالین (ظاء کی آواز میں) پڑھیں ؛ لیکن لکھنے کے معاملہ میں ہمیشہ اسے ضاد ہی لکھا گیا ہے، اس حرف سے بنا ہوا کوئی لفظ کہیں بھی دال یا ظاء سے نہیں لکھا گیا مگر مخطوطہ کے کاتب صاحب نے یہاں یہ کسر بھی

پوری کردی ہے اور شمس ضحیٰ کو دال سے لکھ کر شمس دحیٰ لکھ ڈالا ہے کہ اب اگر کوئی مشاق سے مشاق قاری بھی اس ضاد کو صحیح تلفظ سے ادا کرنا بھی چاہے تو کر ہی نہ سکے، کاتب صاحب نے اس حرف کو لوح کتابت ہی سے غائب کردیا ہے۔

(۴) اب اس مخمس کا چوتھا مصرع ملاحظہ ہو، مصرع یہ ہے :

ع زھرۃ الشکل نبتۃ الزھریٰ

مصرع کا آخری لفظ (جو مصرع کا قافیہ بھی ہے) الزھریٰ لکھا ہوا ہے اور اس کا مصداق جگر گوشۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا لقب الزھراء (جو بالمد ہے بالقصر نہیں ہے) عام طور پر مشہور ہے، اس الزھراء کو مخمس کے چوتھے مصرع میں الزھریٰ (بالقصر) یہاں کاتب صاحب نے لکھ دیا ہے یا حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے ضرورت قافیہ کی بنا پر یہ تصرف فرمالیا ہے ؛ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ آپ کے اصل لقب الزھراء سے اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ اگلے ہی مخمس میں حضرت نے آپ کا لقب زھرا ہی نظم فرمایا ہے۔

(۵) پانچواں خمسہ یوں ہے :

خمسۃ ناطق بھم فرقان فلیطالع بسورۃ الرحمٰن

انّ زھراء وزوجہا بحران فیھما بنان لولوءٌ مرجان

والنبی کان برزخاً ما بین

اس مخمس کے دوسرے مصرع کا پہلا لفظ فلیطالع ہے جو مخطوطہ کے مطابق امر غائب معروف کا [illegible] احد مذکر غائب کے طور پر لکھا گیا ہے لیکن مترجم

صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے "پڑھ لو سورۂ رحمٰن کو" اس انداز ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے امر حاضر مان کر ترجمہ کیا ہے مگر اس کا امر حاضر تو صرف طالع ہوگا، فا اور لام نہ ہوگا؟

طالبان تحقیق اور محققین کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ صیغہ کون سا ہے؟ اور غلطی کہاں پر ہوئی ہے؟ ویسے راقم السطور کی فہم ناقص کے مطابق نہ تو مخطوطہ کا عکس واعراب صحیح ہے نہ جناب مترجم کا ترجمہ درست ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ صیغہ لکھا تو جائے گا اسی شکل میں جس شکل میں مخطوطہ کا عکس ہے لیکن اسے امر غائب معروف کی بجائے امر غائب مجہول کا صیغہ ماننا بہتر اور آسان ہوگا اس صورت میں فَلْیُطَالَعْ لکھا جائے گا یعنی دوسرے لام کو فتحہ دیا جائے گا اور ترجمہ یوں ہوگا کہ:

سورۂ رحمٰن کا مطالعہ کیا جانا چاہیے (یا "مطالعہ کیا جائے")

مخمس کے تیسرے مصرع میں زہراء کے بعد وزوجہا کا فقرہ ہے مگر مخطوطہ میں زا کے بعد کا واؤ عکس میں نہیں آسکا ہے۔

بند کے پانچویں مصرع میں برزخ کا لفظ آیا ہے مگر نہ تو زا کی صحیح شکل بن سکی ہے نہ ہی اس پر نقطہ ہے، اس زا کو نقطہ دیکر صحیح شکل دیدی جائے مگر یہ ایک لطیفہ بھی ملحوظ رہے کہ زاء کے نقطہ کی کمی نے یہاں ایک دوسرا نکتہ پیدا کر دیا ہے اور شبہ یہ ہوجاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اسے دال ہی کے ساتھ تو نہیں لکھا ہے، اس طرح لکھ کر لفظ پردہ کی حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہا ہو کہ پردہ کا بھی لفظ عربی زبان میں برزخ ہوگیا ہے۔

(۶) پانچویں مخمس کے دوسرے مصرع میں زیر کی جگہ زبردستی زبر لکھ دینے

کی ایک چھوٹی سی فروگذاشت پہلے بھی نشاندہی میں نہ آسکی تھی وہ کہ مِنْ یداللہ کے فقرہ میں مِنْ حرف جر ہے جو بالکسر ہے اسے مَنْ (بالفتح) لکھ دیا گیا ہے جسکی وجہ سے معنی مختل ہوگئے ہیں۔

(۷) چھٹے، ساتویں، اور نویں مخمس میں توحید شکنی کے ایسے مضامین ہیں کہ اشعار کی اعرابی ولفظی اغلاط کی نشاندہی کے لیے ذہن متوجہ ہی نہیں ہوسکا، ان خمسہ جات کی معنویت تو راقم السطور کو ماورائے حقیقت و معرفت ہی نظر آرہی ہے اور ضرورت اس تحقیق کی نظر آرہی ہے کہ فلسفۂ وحدۃ الوجود تو جیسا کچھ تھا تھا، حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کے دو مکتبۂ فکر وجود میں آگئے اور بحث و مباحثہ کے معرکے ہوتے رہے۔ اب تحقیق اس بات کی ہونی ہے کہ وحدۃ الوجود کا یہ فلسفہ کیا اپنے مرکز اصل سے آگے بڑھکر وجود باری کے سوا دوسرے وجودوں کی بھی وحدت دریافت ہوگئی ہے۔ دائرۂ گفتگو اپنے موضوع سے آگے نہ بڑھنے پائے اس لیے عافیت کا پہلو اسی میں نظر آتا ہے کہ بزرگوں کی باتیں بزرگ ہی سمجھ سکتے ہیں حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی علیہ الرحمہ کا رسالہ "تسویہ" اورنگزیب عالمگیر نے انکے خلیفہ شاہ محمدی فیاض علیہ الرحمہ (مدفون اکبرآباد) کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ یہ رسالہ آپ کے شیخ کا رسالہ ہے اس کے مضامین خلاف شرع ہیں یا تو اس رسالہ کا جواب دیجئے یا اسے آگ میں ڈال دیجئے۔

حضرت شاہ محمدی علیہ الرحمہ نے نہایت ہی پرسکون وطمانیت جواب دے دیا کہ:

رسالہ کے مقام تک ابھی میری رسائی نہیں ہوئی ہے کہ جواب دوں اور مجھ درویش کے گھر میں آگ ہی کہاں جلتی ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ خود شاہی مطبخ میں نذر آتش فرمادیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال یہاں بھی ہے کہ نہ تو حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کے مقام عرفان سے واقفیت نہ ہی ان کے اس کلام عربی کے ان کی طرف انتساب کی صحت کا

اطمینان تو کیوں انکی ذات کو موضوع گفتگو بنایا جائے۔

ع مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ع در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق — ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

(۸) آٹھویں بند کا ترجمہ کھٹکتا ہے۔ پورا بند اور آخری مصرع کا ترجمہ یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

خمسۃ حبّھم کحبّ اللہ — من دعاھم فقد اجاب اللہ

من علیھم بغی فواویلاہ — خیر الدین فیہ مع دنیاہ

فقنا ربّ اٰخر الامرین

(یا اللہ ہمیں ان آخر کی دونوں باتوں سے محفوظ رکھیو)

مخمس کے چوتھے مصرع میں خیر الدین مع دنیاہ کے درمیان فیہ کا اضافہ بے ضرورت صرف وزن شعر پورا کرنے کے لیے شاید بڑھایا گیاہے پھر اس فیہ کی ضمیر کا مرجع بھی نامعلوم ہے۔

بند والے آخری مصرع کا ترجمہ مترجم صاحب نے صحیح نہیں کیاہے، مصرع کا جو ترجمہ وہ کررہے ہیں اگر حضرت شاہ صاحب کو وہ بات کہنی ہو تو مصرع میں اٰخر الامرین کی بجائے کلا الامرین کا فقرہ ہونا چاہیے تھا۔ پورے بند میں کل دو ہی باتیں تو کہی گئی ہیں کہ ان پنجتن کی محبت اللہ کی محبت ان سے کچھ مانگنا گویا اللہ ہی سے مانگناہے اور دوسری بات یہ کہ ان سے بغاوت وسرکشی کرنے والا مستحق لعنت وہلاکت ہے دین و دنیا میں نقصان وخسارہ میں رہے گا۔

ان دو باتوں کے بعد بند کے مصرع میں یہ دعا کی گئی ہے کہ اے اللہ! ہمیں ان دو باتوں میں سے آخری بات یعنی ان کی بغاوت وسرکشی سے محفوظ رکھیئے، مترجم صاحب کے ترجمہ نے مطلب ہی کو خبط کردیا ہے۔

مجموعۂ قصائد کے خمسۂ دیگر سے متعلق معروضات کو ایک بہت ہی چھوٹی سی کتابت کی فروگزاشت کا ذکر کرکے ختم کرتا ہوں انیسویں مخمس کے تیسرے مصرع میں باللہ کا لفظ باالله لکھ گیاہے، درمیانی الف زائد اور غلط ہے اور یہ غلطی اتنی کثرت سے ہوتی ہے کہ اسے غلطی کہنا مشکل ہوگیاہے۔

اب زیر قلم مضمون کی صرف ایک آخری قسط اور باقی رہ جاتی ہے جو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب مناجات کی نسبت کی تحقیق اور اس کی لسانی وادبی فروگزاشتوں سے متعلق ہوگی جن میں سے بعض فروگزاشتیں تو خود اصل مناجات کے عربی الفاظ سے متعلق بھی ہوں گی۔ (باقی)

اخبارِ علمیہ

گذشتہ دنوں عالم افلاک میں تلاش و سرگردانی کی انسانی کوششوں کی
ایک اور اہم خبر ملی، کواکب و سیارگان کے رازِ سربستہ کا پتہ لگانے میں دو
خلائی جہازوں VIKING اور VOYAGER کا نام نمایاں ہے جنھوں نے
مریخ اور زہرہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ان کے کوچہ کی سیر کی، لیکن اب
گلیلیو خلائی جہاز نے سعد اکبر اور قاضی فلک مشتری کے در تک رسائی پانے
میں کامیابی حاصل کرلی ہے، اس کامیابی پر سائنسدانوں نے بڑی مسرت کا
اظہار کیا اور گلیلیو منصوبہ کے خاص دماغ ٹارنس جانسن نے کہا کہ "اس وقت
تک یقین نہیں آیا جب تک خود آنکھوں سے دیکھ نہ لیا"۔ یہ حیرت و مسرت
اس لیے بھی سوا ہوئی کہ مشتری کا معاملہ زہرہ و مریخ سے بہت مختلف ہے
یہ عظیم سیارہ انتہائی طاقتور مقناطیسی میدانوں اور نہایت تیز و تند شعاعوں
سے گھرا ہوا اور قریباً تمام کا تمام ہائیڈروجن اور ہیلیم سے لبریز ہے، یہ وہ
عناصر ہیں جو ابتدائے آفرینش میں ایک ساتھ ترکیب پاکر سیارہ کی شکل
میں اس نظام شمسی میں ظاہر ہوئے تھے، مشتری کی گردابی گیس کی رفتار
انسان کے وہم و گمان سے کہیں تیز تر ہے۔ اس کی فضا کا دباؤ ۱۷،۶۰۰
کیلومیٹر فی گھنٹہ ہے، ایسے حالات میں گلیلیو ہوائی جہاز سے نکلنے والے ایک

تحقیقاتی سیارچہ کا مشتری کے حدود میں داخل ہونا اور بیش قیمت تصاویر بھیجنا
یقیناً بڑا کارنامہ ہے، ان تصویروں سے اب یہ امید کی جاتی ہے کہ مشتری
کے ۱۶ معلوم چاند میں قریب ۸ کی صاف اور واضح تصویریں مل جائیں گی،
ان کے علاوہ خاتم مشتری اور اس کے مقناطیسی میدانوں اور اس کی راکھ
کے انبار اور انتہائی طاقتور ذرات کے متعلق ایسے معلومات فراہم ہوسکیں گے جن سے
اس سیارہ کی ساخت و ترکیب کی بہترین توجیہ کی جاسکے گی، تحقیقاتی سیارچہ
کے متعلق سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ۷۵ منٹ تک ان نادر تصویروں کے
بھیجنے کے بعد جب اس نے مشتری کی امونیا گیس کے بلوری بادلوں والی سطح
کو پار کیا ہوگا تو وہ انتہائی کھولا دینے اور جھلسا دینے والی اس امونیا گیس
کے دل بادل سے دوچار ہوا ہوگا جو ۳۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کے تیز ترین گرداب
کی شکل میں موجود ہیں، اگر اس نے اس کو بھی پار کرلیا ہوگا تو اس کے بعد
ایک اور طوفان برق و باراں اس کی راہ میں آیا ہوگا اور پھر اس کی شدت
و تپش اور دباؤ کے بعد وہ خود بھاپ بن کر نیست و نابود ہوگیا ہوگا،
تاہم گلیلیو ہوائی جہاز ابھی کچھ عرصہ مشتری کا طواف ایک فاصلہ سے کرتا
رہے گا اور یہ خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔

مشتری کی ایک جھلک پانے کا سرور ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ ٹیکساس
امریکہ کی انجمن فلکیات کی ایک کانفرنس میں ایک اور حیرت انگیز انکشاف
کیا گیا کہ نظام شمسی کے سیاروں کے علاوہ دو سیارے اور دریافت ہوئے
ہیں جو مشتری سے بھی عظیم و ضخیم ہیں اور نسبتاً ۳۵ نوری سال کے قریب

دائرہ میں ہیں، اس انکشاف ودریافت کا سہرا سان فرانسسکو کے ایک ماہر فلکیات جیوفری مرسی اور ان کے رفیق کار پال ٹبلر کے سر ہے جنھوں نے آٹھ سال کی محنت وتحقیق کے بعد یہ کامیابی حاصل کی، ان کی تحقیق کے مطابق یہ دونوں سیارے دُب اکبر اور بنات النعش کے دو ستاروں کے محور پر گردش کرتے ہوئے دیکھے گئے اور یہ کہ ان کی سطح کافی سرد یعنی قریب منفی ۸۰ ڈگری سیلسیس ہے، اندازہ یہ بھی ہے کہ اس سرد سطح کے نیچے ایک منطقہ ایسا بھی ہے جہاں درجۂ حرارت معتدل ہے، وہاں رقیق وسیال پانی بھی موجود ہے، ایک ایسے منطقہ کے وجود کے آثار بھی ملے ہیں جہاں نامیاتی مادہ، پانی کے ساتھ جوش وتخمیر کے مراحل سے گزرتا ہے، ظاہر ہے اس تحقیق کے بعد سائنسداں حد درجہ پُرجوش اور ولولہ سے بھرے ہوئے ہیں ان کے خیال میں یہ تحقیق انیق ایک ایسے دور کی جانب رہنمائی کرتی ہے جسے پوری دنیا کے تحقیقی اداروں میں 'شاندار علمی جوش وخمیر' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، ان ماہرین فلکیات کے خیال میں وہ تکنیک جس کو INTER FER-OMETRY کا نام دیا گیا ہے۔ اس دم بخود کر دینے والی تحقیق کی خاص دین ہے جس سے ستاروں کے درجۂ حرارت، کیمیائی اثرات اور سائنسدانوں کے قیاسات پر مبنی دوسرے خواص وکوائف کا علم زیادہ یقین واعتماد کے ساتھ ممکن ہوگا جس کے نتیجہ میں شاید دس بیس برس کے بعد اس سوال کا جواب بھی مل جائے کہ کیا ہم اس کائنات میں تنہا ہیں؟

ع۔ص

وفیات

آہ! بدرِ کامل غروب ہوگیا۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ۱۹/ جون کو مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح و دائرہ حمیدیہ رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کئی برس سے انہیں درد پا کی شکایت تھی، اس کے علاج کے لئے بمبئی تشریف لے گئے مگر تکلیف کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی، آمد و رفت کا سلسلہ اور ساری سرگرمیاں منقطع ہو گئیں۔ تاہم دل و دماغ کام کر رہا تھا، مشکلات اور پیچیدہ مسائل میں رہنمائی بھی فرماتے تھے۔

۱۶/ جون کو مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ تھا، وہیں ان کی شدید علالت کی خبر ملی، ۱۸/ جون کو عیادت کے لئے گیا تو گردش روزگار کا یہ عجیب منظر دیکھ کر بدحواس ہو گیا کہ بلبل ہزار داستاں کی طرح چہکنے، اپنی گل افشانی گفتار سے مجلس کو زعفران زار بنانے اور اپنی خطابت اور خوش بیانی سے مسحور کرنے والے کی زبان گنگ ہو گئی ہے اور میں یہ حسرت ہی لئے رہ گیا کہ ع بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر تھا۔ شاید اشارے سے کچھ کہا ہو مگر میں سمجھ نہیں سکا، ہوش و حواس بھی اچھی طرح بجا نہیں تھے۔ جسم گل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، واپسی میں راستے بھر اور رات کو بھی بڑی دیر تک عجیب خلش اور بے چینی رہی، یہ کرب و اضطراب اس لئے تھا کہ مدرسۃ الاصلاح کے اغراض و مقاصد کا حقیقی مبلغ اور "فکر حمید" کا اصلی شارح و ترجمان دنیا سے رخصت ہونے والا ہے، اور اس کا کوئی بدل اور جانشین نہیں ع افسوس کہ از قبیلہ مجنوں کسے نہ ماند۔

دوسرے ہی دن ۱۲/ بجے متوقع حادثہ کی اطلاع بھی آگئی ساڑھے پانچ بجے جنازہ اٹھا تو جم غفیر ساتھ تھا، قرب و جوار کے لوگوں، مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ و طلبہ اور دوسرے بے شمار قدردانوں نے مدرسہ کے سب سے مایہ ناز فرزند اور علوم و

معارف فراہی کے سب سے بڑے ہندوستانی واقف کار کو سپردِ خاک کر دیا۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اور فارسی کتابیں گھر پر پڑھیں، ان کی عربی تعلیم مدرسۃ الاصلاح میں ہوئی۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور بعض دوسرے حضرات سے بھی کتابیں پڑھیں لیکن ان کی اصل تعلیم و تربیت علامہ شبلیؒ کے خاص شاگرد مولانا شبلی متکلم ندوی کے سایہ عاطفت میں ہوئی، مدرسہ کا ہشت سالہ کورس انھوں نے اپنی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے چند برسوں ہی میں مکمل کرلیا۔

مولانا بدرالدین اصلاحی ایک خوش حال زمیندار گھرانے کے فرد اور اپنے والد کے بڑے چہیتے تھے، گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا اس لئے انھوں نے ملازمت یا درس و تدریس سے ان کا وابستہ ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی زمانے میں رنگون (برما) میں کچھ دیندار اور صاحب ذوق لوگوں نے ایک حلقہ قرآن قائم کیا جس کی نگرانی و رہنمائی کے لئے انھیں ایک مناسب اور خوش بیان شخص کی تلاش ہوئی تو مدرسۃ الاصلاح کے ذمہ داروں کو خط لکھا، سب کی نظر انتخاب مولانا بدرالدین صاحب پر پڑی مگر ان کے والد انھیں اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، تاہم مولانا شبلی متکلم وغیرہ کے شدید اصرار پر بادلِ ناخواستہ راضی ہوگئے، برما میں ان کی بڑی پذیرائی ہوتی اور ان کے درس قرآن میں بڑا مرجوعہ ہونے لگا۔ لیکن ابھی سال بھر نہیں گذرا تھا کہ والد کی علالت کی خبر پاکر گھر واپس لوٹ آئے، والد کا وقت پورا ہو چکا تھا، ان کے بعد زمین اور جائداد کے مسائل میں ایسا الجھے کہ برما سے مسلسل خطوط آنے کے باوجود گھر چھوڑنا ممکن نہیں ہوا۔

ایسے غیر علمی ماحول میں جہاں ہر وقت مزدوروں سے سابقہ اور آئے دن زمین اور جائداد کے جھگڑے درد سر بنے رہتے تھے علم و فن سے اشتغال اور کتب بینی اور مطالعہ کا شوق باقی رہ جانا حیرت انگیز ہے، ان سے جب جب گفتگو ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ اکثر اہم اور ضروری چیزیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ میں طالب علمی کے

زمانے میں طلبہ کی انجمن کا سکریٹری تھا، وہ عموماً ہفتہ میں ایک بار مدرسہ ضرور تشریف لاتے تھے، آنے کے ساتھ ہی نئے رسالے اور کتابیں طلب کرتے، معارف، برہان، جامعہ، ترجمان القرآن اور صدق جدید وغیرہ پابندی سے پڑھتے تھے اور ان کے اچھے مضامین کی نشاندہی بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ جامعہ میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا ایک مضمون "فرض کفایہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کو بہت پسند کیا اور مجھ سے بھی کہا کہ اسے ضرور پڑھو، اچھا اور فکر انگیز مقالہ ہے، کتابوں پر کہیں کہیں نوٹ اور حاشیے بھی لکھ دیتے تھے۔

ایک مرتبہ میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے بڑے صاحبزادے کے اصرار پر ان کے دولت کدہ پر گیا، ہم لوگ پہنچے تو مولانا موجود نہیں تھے، موقع پاکر مچھلیوں کا شکار کرنے چلے گئے، رات گئے لوٹے تو مولانا لالٹین کی روشنی میں گیتا کے مطالعہ میں غرق تھے، ہم لوگوں کے آنے کی آہٹ ہوئی تو فرمایا کہ مچھلی پکی ہے، بکنے آئی تھی، میں نے گھر میں بھجوا دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے گیتا میں اللہ تعالیٰ کی صفت حکمت کا ذکر نہیں ملتا۔

علم و فن سے اشتغال ہی کی بنا پر وہ بعض رسالوں میں کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے تھے، ۱۹۳۶ء میں ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی تصنیفات اور ان کے اردو ترجمے کی اشاعت کے لئے دائرہ حمیدیہ کا قیام عمل میں آیا جس کی طرف سے الاصلاح کے نام سے ایک ماہوار علمی و تحقیقی رسالہ مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلا جو گو شعلۂ مستعجل کی طرح اپنی چمک دمک دکھا کر بہت جلد غائب ہوگیا تاہم اس نے مختلف موضوعات خصوصاً قرآنیات پر جو بلند پایہ اور فکر انگیز مضامین شائع کئے وہ آج بھی قرآن مجید کے طالب علموں کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں۔ الاصلاح کے گنے چنے مضمون نگاروں میں ایک اہم نام مولانا بدرالدین صاحب کا بھی ہے۔ ان کے حسب ذیل مضامین اس میں شائع ہوئے۔

علامہ شبلی پر فتوائے کفر (اگست ۱۹۳۶ء) پاداش عمل (ستمبر ۳۶ء،

مصدقا لما بین یدیہ کی صحیح تاویل (نومبر ۳۶ء) حروف مقطعات (اکتوبر ۱۹۳۷ء) لفظ آلاء کی تحقیق (نومبر ۳۷ء) واخر متشابہات (دسمبر ۳۷ء)۔

یہ سب مضامین ملک کے صاحب علم و ذوق طبقے میں بہت پسند کئے گئے۔ مصدقا لما بین یدیہ پر ان کا معرکۃ الآرا مضمون شائع ہوا تو ایک بزرگ مولوی حافظ سید محمد طہٰ اشرف امتھوی نے اس پر کچھ اشکالات وارد کئے، اس کے جواب میں جون و جولائی ۳۷ء میں انہوں نے بہت مدلل مضمون لکھ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

نگار لکھنو اور صدق جدید لکھنو بھی ان کی قلمی جولان گاہ رہے ہیں، موخر الذکر میں اکثر مراسلے شائع ہوتے تھے، مولانا کا ادبی ذوق بھی اچھا اور رچا ہوا تھا، خصوصاً فارسی کا مذاق بلند تھا، وہ سخن فہم تو تھے ہی۔ میرا خیال ہے کہ مشق سخن بھی کی ہوگی۔ ابتداء میں وہ اپنا نام "بدر" ہی لکھتے تھے۔

مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اپنی وفات کے وقت اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے علمی متروکات اور مسودات مولانا بدرالدین اصلاحی کو سپرد کر گئے تھے، اس بیش بہا متاع کی نہ صرف یہ کہ انہوں نے حفاظت کی بلکہ ہمیشہ اس کی ترتیب و اشاعت کے لئے فکر مند بھی رہے، انہوں نے مولانا کی متعدد مطبوعہ کتابوں کو جو دستیاب نہ تھیں دوبارہ طبع کرایا اور کئی غیر مطبوعہ تصنیفات کو اپنے فاضلانہ عربی مقدمے کے ساتھ شائع کیا، ان کے فارسی کلام کو بھی از سر نو شائع کیا اور اس پر فارسی زبان میں بیش قیمت مقدمہ تحریر کیا۔

ان کے محققانہ اردو مضامین اور عربی و فارسی کے عالمانہ مقدمے دیکھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کرے گا کہ وہ ایک گاؤں کے علم و ادب کش ماحول میں جہاں نہ کتابیں میسر تھیں اور نہ کوئی کتب خانہ تھا، بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔

تقریر و خطابت کا ملکہ خداداد تھا، جو لوگ ان کے اس جوہر سے واقف تھے وہ بڑے اصرار سے انہیں تقریر کے لئے مدعو کرتے تھے لیکن اپنی کم آمیزی اور

طبعی بے نیازی کی وجہ سے وہ اکثر لوگوں کو ٹال دیتے تھے، تاہم حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم، مولوی حاجی عین الحق صاحب مرحوم، جناب شوکت سلطان مرحوم سابق پرنسپل شبلی کالج، مولوی عبدالرزاق مرحوم بکھرا اور بعض دیہاتوں کے خاص اہل تعلق کا اصرار کبھی کبھی ان کے انکار پر غالب آجاتا تو پھر ان کی گل افشانیِ گفتار دیدنی ہوتی۔ راقم کو کئی بار ان کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا، مدرسہ کے ایک جلسہ میں جس کے تین اجلاس ہوتے اصل اور تنہا مقرر وہی تھے، رات کے جلسے میں تقریباً چار گھنٹے تک مسلسل نہایت مربوط، مدلل اور عالمانہ تقریر کرتے رہے، نہ خیالات کے تموج میں کبھی فرق آیا اور نہ الفاظ کا خزانہ کبھی خالی ہوتا دکھائی دیا۔

ان کی گفتگو بھی بڑی موثر، دل نشین اور دل پذیر ہوتی، بات کرتے تو خیال ہوتا کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

ان کو کسی کے سامنے گفتگو کرنے میں کبھی جھجھک نہیں ہوتی، بحث و مباحثہ میں ان سے پیش پانا ناممکن تھا، کوئی کتنی ہی شدید مخالفت پر آمادہ ہوتا اور بعض لوگ بڑی برہمی سے بہت نامناسب لب و لہجہ میں اعتراضات کرتے مگر وہ ضبط و تحمل کا پیکر بن جاتے اور بڑی خندہ جبینی اور متانت سے ایک ایک بات کا مدلل جواب دے کر انہیں مطمئن اور ٹھنڈا کر دیتے، ایک مرتبہ بعض لوگوں نے دائرہ حمیدیہ اور مدرسہ کے تعلق سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو ان کی جانب سے کچھ بدظن کر دیا تھا، شاہ صاحب نے سرائے میر جاکر جب ان سے رودر رو باتیں کیں تو ہر طرح مطمئن ہوگئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت ان پر جس قدر فیاض تھی، اسی قدر وہ بے نیاز واقع ہوئے تھے، مجھے ہمیشہ اس کا ملال رہے گا کہ ان کی غیر معمولی علمی و دماغی قابلیت سے دنیا کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا، اگر انہوں نے اپنے اعلا دل و دماغ اور حیرت انگیز لیاقت و صلاحیت سے کام لیا ہوتا تو مولانا حمید الدین فراہیؒ کا خزانہ علم و فکر اور متاع گرانمایہ اس کس مپرسی کی حالت میں نہ ہوتی۔

مولانا بدرالدین صاحب کی خدمت کا خاص میدان مدرسۃ الاصلاح تھا، اس کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، اس کے لئے انہوں نے جس ایثار و قربانی سے کام لیا اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مولانا فراہیؒ کے چھوٹے بھائی اور ناظم مدرسہ مولوی حاجی رشید الدین انصاری نے اپنی معذوری اور پیرانہ سالی کی بنا پر جب اپنی معاونت اور نیابت کے لئے ان کا انتخاب کیا تو یہ مدرسہ کا بڑا بحرانی دور تھا، اس کی مالی حالت اس قدر سقیم ہو گئی تھی کہ نہ اساتذہ کو تنخواہیں ملتی تھیں اور نہ طلبہ کو کھانا ملتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا مسعود عالم ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مدرسہ سرائے میر اور جون پور گیا تھا، کل واپس آیا ہوں، سرائے میر سخت مالی مشکلات میں ہے، آٹھ ہزار کا مقروض ہے" (مکاتیب سلیمان ص ۱۵۶) لیکن مولانا بدرالدین مرحوم نے جب نائب ناظم کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو ان کی مسلسل محنت، خوش انتظامی اور حسن تدبر سے مدرسہ کے تمام قرض ادا ہو گئے۔ مطبخ اور دفتر کی خراب حالت درست ہو گئی، اساتذہ اور کارکنوں کو ماہ بہ ماہ تنخواہیں اور طلبہ کو وقت سے کھانا ملنے لگا، تعلیم و تربیت کا نظام بہتر ہو گیا اور مدرسہ مالی حیثیت سے بھی مستحکم ہو گیا، حاجی صاحب کے انتقال کے بعد ناظم کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا، اس وقت سے ایک دو برس چھوڑ کر انتقال کے وقت تک وہی اس منصب پر فائز رہے۔ گو وہ ایک کامیاب ناظم تھے اور انہوں نے مدرسہ کو بڑی ترقی و وسعت دی اور اس کی شہرت، عظمت، وقار اور استحکام میں اضافہ بھی کیا تاہم جب انہوں نے مدرسہ کا نظم و نسق درست کرنے کے لئے اصلاحات شروع کیں، ڈھیلے ڈھالے نظام کو چست کرنا چاہا اور مدرسہ کے اصول و مقصد اور مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھا تو بعض لوگ اس کی زد میں آئے اور ان کا ذاتی مفاد بھی متاثر ہوا، اس کی وجہ سے ان کو سخت شکایتیں پیدا ہوئیں اور وہ مدرسہ کو بھی نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مولانا ہر بحران سے مدرسہ کو نکالنے میں کامیاب رہے، انہوں نے ہر

قسم کی زحمت اور تکلیف خود برداشت کی مگر اپنے بزرگوں کی اس یادگار پر کوئی آنچ نہیں آنے دی، برابر اس کی حفاظت اور پاسبانی کرتے رہے، ان کے بزرگ، احباب اور رفقا ایک ایک کر کے مدرسہ کو چھوڑتے گئے، یہاں تک کہ ایک قافلہ سالار کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے یہ شکایتی جملہ نکل گیا "افسوس ہے کہ مجامع کے مقابلہ میں مدارس کی افادی حیثیت پر نظر نہیں پڑتی" (مکاتیب سلیمان ص ۱۵۰) مگر انہوں نے اور مولانا اختر احسن اصلاحی نے مدرسہ کی خدمت کا جو عہد و پیمان باندھا تھا، اسے عمر بھر نباہا، مولانا اختر احسن اصلاحی کی وفات کے بعد وہ گو اکیلے رہ گئے تھے مگر زندگی بھر مدرسہ کی عزت و آبرو بنے رہے۔

مولانا بدرالدین صاحب بڑے خلیق، متواضع، ملنسار، خوش مزاج اور باغ و بہار شخص تھے، افسردہ سے افسردہ آدمی بھی ان کے پاس پہنچ کر ہشاش بشاش ہو جاتا اور اپنے غم و اندوہ کو بھول جاتا، صبر حلم اور ضبط و تحمل کا پیکر تھے، انتقام پر عفو و درگذر کو ترجیح دیتے، بڑے سے بڑے غم کو پی جانا ان کی عادت ثانیہ تھی، سخت مشکلات اور مسائل میں گھرے ہوتے مگر چہرے بشرے سے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دیتے، غصہ ہونا اور برہم ہونا جانتے ہی نہیں تھے، سخت کلامی اور دشنام سن کر بھی آزردہ اور چیں بہ جبیں نہ ہوتے، بڑے مہمان نواز اور وانی لعبد الضیف ما دام نازلا کے مصداق تھے، علو، گھمنڈ اور پندار کی ذرا بھی خو بو نہ تھی۔

وہ مدرسۃ الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ کے واقعی بدر کامل تھے جس کے غروب ہونے سے وہاں تاریکی چھا گئی ہے، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے۔ آمین!

"ض"

مطبوعات جدیدہ

دیوان غالب از جناب کالی داس گپتا رضا، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت وطباعت اعلیٰ درجہ کی، صفحات ۵۶۳، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ، ۱۰۷، جولی بھون، ۱۰ نیو رین لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔

یہ کتاب فاضل مرتب و محقق غالب جناب کالی داس گپتا رضا کے ذوق و جستجو اور ان کی نفاست و خوش سلیقگی کا تازہ نمونہ ہے، انہوں نے دیوان غا کو سنہ وار تاریخی ترتیب کے ساتھ پہلی بار ۱۹۸۸ء میں شایع کیا تھا، دو برس کے بعد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوگیا تھا، اس میں انہوں نے دیوان غالب کے تمام قدیم و مستند نسخوں اور غالب کے اولین اردو منظوم کلام کے علاوہ غالب کے بعض غیر متداول اور متفرق اشعار کا جائزہ بھی لیا او اور توقیت غالب کے عنوان سے سوانح غالب کا گویا مکمل سنہ وار ذکر کیا تھ یہ نسخہ اس لحاظ سے بھی ممتاز تھا کہ اس میں اشعار کی فہرست سال فکر اور حرو تہجی دونوں اعتبار سے دی گئی تھی، اب زیر نظر طبع جدید میں چند مزید اہم اضا کیے گئے ہیں جیسے پہلے نسخوں میں اشعار کی ترتیب میں کچھ فرق تھا اب اسے مختلف مآخذ کی مدد سے روایت کے مطابق درج کیا گیا ہے، غالب سے منسو بعض مشکوک اشعار کو متن سے خارج کرکے ایک جدا باب میں یکجا کردیا گیا

بعض غزلوں اور اشعار کا سال فکر دوبارہ متعین کیا گیا ہے، گذشتہ اشاعتوں میں سال فکر ہر غزل پر درج تھا اب اسے ہر صفحے کے شروع میں لکھا گیا ہے، ان اضافوں نے اس اشاعت جدید کی قدر و قیمت کو واقعتاً دو چند کردیا ہے، فاضل محقق نے آغاز میں لکھا ہے کہ اب وہ عمر کے سترویں سال میں داخل ہو رہے ہیں اور اب شاید ان سے تن تنہا کوئی ضخیم و موقر کام بن نہ پڑے، ہم ان کی درازی عمر کے لیے مشہور دعائے غالب پر آمین کہتے ہوئے توقع کرتے ہیں کہ عمر کے ساتھ انکے قلم کی طاقت و روانی میں برکت روز افزوں ہو۔

قصبہ کوڑہ تاریخ و شخصیات از جناب مولانا محمد عبد السمیع ندوی مرحوم

متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت مناسب صفحات ۴۵۶، قیمت درج نہیں، پتہ:

کمپیوٹر اردو کتابت سنٹر، ندوی منزل ندوہ روڈ لکھنؤ۔ یوپی۔

مردم خیز بستیوں اور انکے نمایاں خانوادوں کی سوانح نگاری کی قدیم علمی و اسلامی روایت میں یہ کتاب ایک اور اضافہ ہے، کوڑہ جہاں آباد کانپور اور الٰہ آباد کے درمیان گنگ و جمن کے دامن میں نسبتاً کم معروف بستی ہے لیکن اودھ کے دوسرے قصبات کی مانند یہ قصبہ بھی عرصہ تک علماء و صوفیہ کا مرکز و مسکن رہا خصوصاً سادات جعفری عریضی کے شرنیل سید قطب الدین سالار بدھ اور انکے اخلاف کا وجود اسکی شہرت و مرجعیت کا خاص سبب بنا، اس کتاب کے مصنف مرحوم کا تعلق بھی اس خانوادہ شریف سے ہے، انہوں نے بڑی محنت و تحقیق سے اس قصبہ کی قدامت و تاریخی اہمیت اور وہاں کے علماء اور بزرگوں کے سوانح کو دلکش اور موثر انداز میں مرتب کردیا اور اس قصبہ کی عظمت پارینہ کے خاموش آثار و باقیات کو گویا زبان عطا کردی، انہوں نے شاہ جمال اولیاء کے مدرسہ کے متعلق لکھا کہ شاید یہ ہندوستان کا سب سے قدیم مدرسہ ہے، ملا لطف اللہ کی مسجد تو اب بھی قایم ہے مدرسہ مٹ چکا ہے اور یہ وہی مدرسہ ہے جس کے فرش سے ملا جیون اور ملا علی اصغر قنوجی جیسے اصحاب فضل و کمال کی شہرت بام عرش تک پہونچی،

بعض دلچسپ تشریحیں بھی آگئی ہیں مثلاً سکھوں والے لفظ خالصہ کی تاریخ شدھی سنگٹھن کی تفصیل اور مخلوط شیعہ سنی قصباتی معاشرہ کے تہذیبی اثرات وغیرہ ایک قصبہ کی تاریخ ہونے کے باوجود اس میں ہندوستان بالخصوص اسلامی ہند کی کامل جھلک نظر آتی ہے، ابواب و فصلوں کی فہرست زیادہ مفصل ہونی چاہیے تھی سنگل دیپ کا ذکر کئی جگہ آیا ہے اسکی نشاندہی ضروری تھی، کتابت کے اغلاط بھی جا بجا ہیں۔

عہد نبوی کا نظام حکومت از جناب پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۱۳۶، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

عالم انسانی کی تاریخ جہاں آرائی و فرماں روائی میں سب سے مبارک و لائق تقلید دور حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں ملتا ہے جب عقاید و عبادات اور اخلاق و معاملات کے عناصر ترکیبی سے ایک مکمل اسلامی معاشرہ کا وجود مسعود سامنے آیا اور اس نے زندگی کے ہر شعبہ پر یکساں توجہ کی، اس مختصر کتاب میں حکومت کے شعبہ کا خاص طور پر جائزہ لیا گیا ہے، فاضل محقق نے ایک ضخیم کتاب اسی موضوع پر سپرد قلم کی تھی زیر نظر کتاب گویا اسی کا خلاصہ ہے، جس میں عہد نبوی کے نظام حکومت کے مختلف شعبوں جیسے شہری نظم و نسق، فوجی تنظیم، مالی و مذہبی نظام پر اہم نکات پیش کیے گئے ہیں، عمال کی تقرری اور ذمہ داروں کے انتخاب کا کمال تحقیق سے جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ ان تمام شعبوں میں انتخاب و تقرری کی بنیاد صرف صلاحیت و لیاقت پر تھی، ایک جگہ شہدائے بیر معونہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مدرسہ صفہ کے فراغت یافتہ معلمین تھے وفود عرب کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک جگہ مختصر مدتی تعلیمی نصاب کا ذکر ہے اسکے علاوہ یہ جملہ بھی محل نظر ہے کہ "انکا فیض عام سب کے لیے تھا" فاضل محقق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں ریزہ ریزہ جمع کرنے کا فن خوب آتا ہے اس رائے کی صداقت اس کتاب سے بھی عیاں ہے۔

ع۔ ص

دار المصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۳۰ روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابو طالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۲۵ روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت ۳۰ روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۲۵ روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ۲۵ روپے

گل رعنا: (مولانا عبد الحئی مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت ۶۰ روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت ۶۰ روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبد السلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ۔

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبد السلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت ۵۰ روپے

اقبال کامل: (مولانا عبد السلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی، نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت ۳۰ روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت ۷۵ روپے